جُمادی الاخریٰ ۱۴۳۷ھ
مارچ ۲۰۱۶ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات

تنظیمِ اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

خطا، نسیان اور جبر و اِکراہ کی معافی
اور دُنیا کی بے ثباتی
(مطالعہ حدیث)
بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

داعی رجوع الی القرآن بانی تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول سُورۃ الفاتحہ و سُورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن
(بارہواں ایڈیشن) ——— صفحات: 360، قیمت 475 روپے

حصہ دوم سُورۃ آلِ عمران تا سُورۃ المائدہ
(دسواں ایڈیشن) ——— صفحات 321، قیمت 425 روپے

حصہ سوم سُورۃ الانعام تا سُورۃ التّوبہ
(ساتواں ایڈیشن) ——— صفحات 331، قیمت 425 روپے

حصہ چہارم سُورۃ یُونس تا سُورۃ الکہف
(چھٹا ایڈیشن) ——— صفحات 394، قیمت 485 روپے

حصہ پنجم سُورۃ مریم تا سُورۃ السّجدۃ
(پانچواں ایڈیشن) ——— صفحات 480، قیمت 575 روپے

حصہ ششم سُورۃ الاحزاب تا سُورۃ الحجرات
(چوتھا ایڈیشن) ——— صفحات 484، قیمت 590 روپے

حصہ ہفتم سُورۃ قٓ تا سُورۃ النّاس
(دوسرا ایڈیشن) ——— صفحات 560، قیمت 650 روپے

یکے از مطبوعات: انجمن خدام القرآن خیبر پختونخوا پشاور

شائع کردہ: مکتبہ خدام القرآن لاہور
36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون (042)35869501-3

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُم بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ علیہ

جلد : 65

شمارہ : 3

جمادی الآخریٰ 1437ھ

مارچ 2016ء

فی شمارہ -/30

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

- اندرون ملک 300 روپے
- بھارت و بنگلہ دیش 900 روپے
- ایشیا' یورپ' افریقہ وغیرہ 1200 روپے
- امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا وغیرہ 1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔کے ماڈل ٹاؤن' لاہور 54700' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000' ای میل: maktaba@tanzeem.org

ای میل برائے ادارتی امور: publications@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔علامہ اقبال روڈ' گڑھی شاہو' لاہور

فون: 36366638 - 36316638

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

✿ عرضِ احوال ——— 5

پس چہ باید کرد......؟ — ایوب بیگ مرزا

✿ بیانُ القُرآن ——— 9

سورۃ النور (آیات ۲۷ تا ۴۰) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

✿ مُطالعۂ حدیث ——— 27

خطا' نسیان اور جبر و اکراہ کی معافی اور دنیا کی بے ثباتی — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

✿ تذکّر و تدبّر ——— 45

قرآن کریم کی اُصولی باتیں (۷) — ڈاکٹر عمر بن عبداللہ المقبل

✿ حُسنِ معاشرت ——— 55

عورت کا مقام و مرتبہ — محمد رشید عمر

✿ تربیتِ نِسواں ——— 63

ہماری بچیاں کیسی تعلیم حاصل کریں؟ — بیگم ڈاکٹر عبدالخالق

✿ دعوت فکر ——— 71

تعلیم و تربیت کے ضمن میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی اہمیت — میجر (ر) حیدر حسن

✿ حُسنِ عبادت ——— 79

وضو کے فضائل اور آداب — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

✿ سبق پھر پڑھ ——— 84

سقوطِ خلافت سے دورِ حاضر تک (۵) — شجاع الدین شیخ

✿ ✿ ✿

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

پس چہ باید کرد.....؟

جس طرح انسان کے جسم کا مدافعتی نظام کمزور پڑ جائے تو وہ مسلسل بیماریوں کا شکار رہتا ہے‘ اس لیے کہ مرض پیدا کرنے والے جراثیم جب بیرون سے حملہ آور ہوتے ہیں تو انسان کا اندرونی حفاظتی نظام (Immune System) دفاع نہیں کر پاتا۔ اسی طرح کسی معاشرے کا اپنی ثقافت یا تہذیب سے تعلق کمزور پڑ جائے تو وہ معاشرہ لازماً کسی دوسری ثقافت کے اثرات قبول کرتا ہے۔ بعض اوقات غیروں کی ثقافت کی چھاپ معاشرہ پر اس قدر گہری ہو جاتی ہے اور وہ غیروں کی تہذیب کو یوں اپنا لیتا ہے کہ اُس معاشرہ کی اپنی ثقافت دم توڑ جاتی ہے اور اپنی تہذیب میں بدتہذیبی نظر آنے لگتی ہے۔ یہاں یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ جو معاشرہ ثقافتی اور تہذیبی لحاظ سے تہی دامن ہو وہ غالب اور زور آور تہذیب کو بڑی خوش دلی سے اور نعمت سمجھ کر اپناتا ہے۔ جبکہ وہ قوم جس کی ثقافتی ٹرین محض پٹڑی سے اُتر گئی ہو‘ وہ طویل عرصہ تک نیم دروں نیم بروں کی کیفیت میں رہتی ہے اور صورت حال کچھ اس طرح کی بن جاتی ہے کہ کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔ یہی معاملہ سیاسی نظام کا بھی ہے۔ اگر کسی قوم کے پاس مضبوط اور مستحکم سیاسی نظام موجود ہے تو وہ کسی غیر قوم کے سیاسی نظام کو اپنے نظام میں دراڑ نہیں ڈالنے دے گا۔ لیکن اگر حاملین نظام اور مقتدر طبقات ذاتی مفادات کے لیے اور مزید اقتدار کی ہوس میں کج روی اختیار کریں اور ڈنڈیاں مارنی شروع کر دیں‘ یعنی مقتدر طبقہ اپنے ہی نظام کو طے شدہ قواعد وضوابط کے مطابق چلانے کے بجائے من مانی کارروائیاں کرنا شروع کر دیتا ہے‘ تو نظام کمزور ہو جاتا ہے اور دوسرا نظام مکمل طور پر نہ سہی کسی نہ کسی سطح پر در آتا ہے۔

مذہب کا معاملہ بھی زیادہ مختلف نہیں ہے‘ اس فرق کے ساتھ کہ مذہب فرد کے لیے انتہائی حساس اور جذباتی مسئلہ ہے۔ کسی فرد کا آبائی مذہب مکمل طور پر تبدیل کر کے دوسرا مذہب اختیار کر لینا بہت کم ہوتا ہے اور پوری ریاست کا بطور ریاست مذہب تبدیل کر لینا‘ یہ بھی انسانی تاریخ میں صرف ایک مرتبہ ہوا ہے۔ لیکن مسئلہ یہاں بھی وہی ہے‘ جب اپنے مذہب سے انسان کا تعلق کمزور ہوتا ہے تو وہ قلبی سکون اور اطمینان کے لیے اکثریت کے مذہب سے یا زور آور

کے مذہب سے بہت کچھ مستعار لے لیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی شے کا تند و تیز بہاؤ ہر اُس چیز کو اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے جس کی جڑیں مضبوط نہیں ہوتیں اور جس کے پاؤں مضبوطی سے جمے نہیں ہوتے۔ ثقافتی‘ سیاسی اور مذہبی طور پر اثر انداز ہونا اور اثر قبول کرنا ایک پیچیدہ عالمی مسئلہ ہے جو بحث طلب ہے۔ جگہ اور وقت کے محدود ہونے کے ساتھ ساتھ چونکہ ہمارا علم اور وِژن بھی انتہائی کم تر اور محدود ہے‘ لہٰذا ہم اس بحث کو پاکستان اور زیادہ سے زیادہ برصغیر تک محدود رکھتے ہیں‘ اور تاریخی لحاظ سے بھی ہندوستان میں مسلمانوں کے زوال اور ہندوستان کے برطانوی سامراج کے تسلط میں آنے کے بعد مسلمانوں پر غیر مسلموں کے تہذیبی‘ سیاسی اور مذہبی اثرات کو سپردِ قلم کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ہمارا مقصد مسئلے کا علمی اور فلسفیانہ پہلو زیر بحث لانا نہیں بلکہ مسلمانانِ پاکستان کا ان تینوں پہلوؤں سے جائزہ لے کر ’’پس چہ باید کرد‘‘ پر خود کو فوکس کرنا ہے۔ یعنی عملی طور پر ہمارا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے؟ آیئے پہلے جانیں کہ مسلمانانِ پاکستان کو حقیقت میں کون سا مرض لاحق ہو چکا ہے اور پھر اس کے علاج کو زیر بحث لائیں گے۔

ہم اسلامی ثقافت سے دور ہوئے‘ پردہ ختم ہوا یا کمزور پڑا‘ بزرگوں اور والدین کی خدمت مشینی دَور کی نذر ہوئی تو اُن کا احترام اور لحاظ بھی جاتا رہا۔ پھر یہ کہ مصروفیت اخوت اور بھائی چارے کو نگل گئی۔ کتنا خوبصورت لفظ ہے ’’ہم سایہ‘‘ یعنی جس کا اور آپ کا سایہ بھی سانجھا ہے‘ اب اُس سے جان پہچان بھی کم ہے‘ ملنا جلنا نہ ہونے کے برابر ہے‘ دکھ سکھ سننا اور باہم بانٹنا بڑی دور کی بات ہے۔ دیوار بر دیوار مکین جب گھر سے باہر نکلتے ہیں تو نظریں موبائل پر گڑی ہوتی ہیں اور اسی پر انگلیاں حرکت کر رہی ہوتی ہیں‘ کبھی کبھار نظریں مل جائیں تو سلام اور ہیلو ہائے کو گڈ مڈ کر لیتے ہیں یا گونگوں کی طرح ہاتھ کے اشارے سے ہی کام چلا لیتے ہیں۔ محنت اور محبت اپنے گھرانے یعنی بیوی بچوں کے لیے مخصوص ہو گئی اور اُن تک محدود ہو گئی۔ اپنے برطانوی آقاؤں کی پیروی میں سالگرہ اب ہماری ثقافت کا حصہ ہے۔ امراء اور بیوروکریٹس کے گھرانوں پر تو شاید وجوب کا درجہ رکھتی ہے۔ سالگرہ میں ہم موم بتیوں کو انگریزی کیک کے اوپر چڑھا دیتے ہیں۔ کوئی حادثہ ہو جائے تو ہم حادثہ گاہ پر موم بتیاں لے کر اجتماعی طور پر کھڑے ہو جاتے ہیں‘ حالانکہ اسلام ترغیب دیتا ہے اور خبردار کرتا ہے کہ آگ سے خود کو بچاؤ‘ لیکن ہم خوشی اور غمی دونوں مواقع پر آگ کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ بہرحال اسلامی ثقافت سے ہمارا تعلق کمزور پڑا تو کسی بدکار پادری کی یاد میں ہم ۱۴ فروری کو ویلنٹائن ڈے مناتے ہیں اور

کسی ہندو کی یاد میں بسنت پر پتنگیں اُڑاتے ہیں۔

سیاسی لحاظ سے مسلمانوں کے کمزور پڑنے کی وجہ نظامِ خلافت سے نظامِ ملوکیت میں منتقل ہونا اور پھر مغربی جمہوریت کو سیاسی اوڑھنا بچھونا بنالینا تھا۔ سیاست کا تعلق چونکہ براہ راست اختیار اور اقتدار سے تھا' لہٰذا مغربی جمہوریت کو ہم نے نظامِ خلافت کے خاتمے پر اپنی مرضی سے لیا اور دوسروں کے جبر سے اسے اپنے ایمان کا حصہ بھی بنایا۔ اس وقت پاکستان میں شاید ہی کوئی مجاہد کسی عوامی اجتماع میں پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کا سامنا کرتے ہوئے جمہوریت سے انحراف کی بات کرے یا نظامِ خلافت کے حق میں آواز اٹھائے۔

سیاسی نظام کے حوالے سے اب اسلامی نکتۂ نظر کے مطابق حق یا ناحق کی بات نہیں کی جاتی بلکہ حزبِ اقتدار ہے اور حزبِ اختلاف ہے۔ آپ کا تعلق اگر ایوانِ اقتدار سے ہے تو حکومت مستقل طور پر حق پر ہے اور اگر آپ اپوزیشن میں ہیں تو آپ کا کام صرف مخالفت کرنا ہے' حق یا ناحق زیر بحث نہیں ہوگا۔ آج پارلیمنٹ میں کھڑا ہو کر سرکاری جماعت کا نمائندہ یہ نہیں پوچھ سکتا کہ وزیراعظم صاحب! آپ اتنے موٹے تازے اور چوڑے چکلے ہیں' آپ کا کُرتا ایک چادر سے کیسے بن گیا؟ بلکہ یہ نمائندہ دلائل سے ثابت کرے گا کہ دو چادریں ہی وزیراعظم کا حق ہے' اس سے ساری قوم اگر ننگی ہوتی ہے تو ہو جائے' یہ جمہوریت کا حسن ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم نظامِ خلافت سے تائب ہو کر اُس مثالی اور بے نظیر نظام کے ثمرات سے محروم ہوئے ہیں تو جمہوریت کی بھی وہ قسم ہم نے اپنائی ہے جس کی مثال شاید ہی دنیا میں کہیں ملتی ہو۔ گویا ہم نظامِ خلافت کو چھوڑ کر نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے۔

اب آیئے مذہب کی طرف۔ مذہب سے تعلق کمزور ہوا تو بدعات کا طومار خود پر لاد لیا۔ نہ ہمارا جینا عین اسلام کے مطابق ہے اور نہ مرنا۔ ہم اسلام پر بس جزوی عمل کرتے ہیں' ہماری اکثریت صرف جمعہ کی نماز ادا کر کے مطمئن ہے' جیسے اتوار کو عیسائی گرجا گھر جاتے ہیں۔ مرید پیر صاحب سے صرف یہ پوچھتا ہے کہ کس طرح کا ''ذکر'' کروں تو دکانداری بڑھ جائے گی؟ شادی بیاہ تو اور بات ہے' مرگ پر بھی ہم نے ہندو رسوم کو اسلامی نام دے کر اپنا لیا ہے۔ شادی ہو تو لڑکی کو رخصتی کے وقت قرآن کے نیچے سے گزارتے ہیں اور قریب الموت مریض کے سرہانے بیٹھ کر یٰسین پڑھتے ہیں۔ مذہب کے حوالے سے حتمی اور آخری بات یہ ہے کہ فرض کا تارک اِلحاد کی طرف بڑھتا ہے اور سنت کا تارک بدعت کو اپناتا ہے۔ بدعات وہ مراسمِ عبودیت ہیں جو انسان دوسرے مذاہب سے اُدھار لے کر اپنے مذہب کو اپنی نفسانی خواہشات

کے تابع کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسلام کے حوالے سے یہ کہ مذہب میں اُن چیزوں کا اضافہ کر لینا جو نبی مکرم ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت نہ ہوں' حالانکہ اُس دور میں ایسا کرنے میں کوئی رکاوٹ بھی نہ تھی۔ یہ صرف اُس وقت ممکن ہوتا ہے جب مذہب سے ہمارا تعلق کمزور پڑتا ہے۔

''پس چہ باید کرد'' کا جواب وہی پرانا جواب ہے' لیکن جتنا پرانا ہے اُس سے کہیں بڑھ کر حتمی ہے۔ فرد' گروہ اور ریاست کی سطح پر ایک ہی جواب ہے: مسلمان ہی نہیں مؤمن بنو! قرآن کو اپنا امام بناؤ' سنت کو اپناؤ' حدیث مبارک کو سنو اور عمل کرو! اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ اکیلا شخص کیا کر سکتا ہے؟ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ فرد قطرہ اور ریاست دریا ہے۔ یہ قطرہ اگر پاک ہو یعنی فرد اللہ کا بندہ بنے یا بندہ بننے کی سنجیدہ کوشش کرتا رہے تو اُس نے اپنا پہلا فرض ادا کر لیا۔ اب اُسے معاشرہ اور ریاست کو مسلمان بنانے کی بھرپور کوشش کرنا ہوگی' وگرنہ وہ بھی اپنے اسلام پر صحیح طور پر قائم نہیں رہ سکے گا۔ یہ نفس اور شیطان کی اُپج ہے کہ اکیلے تمہارے کرنے سے کیا ہوگا؟ جواب یہ ہے کہ میرے کرنے سے اگر دنیا میں کچھ نہ ہوا تو آخرت کا اجر اور جنت کا وعدہ تو اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ سے بڑھ کر اپنا وعدہ پورا کرنے والا کون ہے! دنیا میں اگر مطلوبہ نتائج برآمد ہوں تو ''ہم خرما و ہم ثواب'' کا معاملہ ہے۔ لہٰذا ہم پاکستانی مسلمانوں سے بڑھ کر خوش قسمت کون ہو سکتا ہے جن کے ملک کا استحکام اسلام سے جڑا ہوا ہے۔ لہٰذا خود مسلمان بنو' ریاست کو مسلمان بنانے کی کوشش کرو۔ (یاد رہے اس حوالہ سے مسلمان صرف اس بات کا جواب دہ ہے کہ اُس نے سنجیدگی اور خلوص سے کوشش کی یا نہیں!) اللہ ربّ العزت کا فضل شامل حال ہوگا اور آخرت بھی سنور جائے گی اور یہی حقیقی کامیابی ہے۔ اور اگر ہم حقیقی مسلمان نہیں بنتے' نظریۂ پاکستان کی عملی تعبیر سامنے نہیں آتی تو پاکستان ہی نہیں دنیا کی تمام قوتیں بھی پاکستان کو لسانی اور صوبائی تعصّبات سے نہیں بچا سکتیں۔ فرقہ واریت کا خاتمہ ممکن نہیں ہوگا' دہشت گردی کو جواز ملتا رہے گا۔ ہماری گردنیں غلامی کے پھندے سے آزاد نہیں ہو سکتیں اور تباہی و بربادی ہمارا مقدر ہوگی۔ لبرل ازم پر جتنا اصرار کرو گے' سندھی قوم پرستی اتنی ہی اُبھرے گی' مہاجر اور مقامی کی جنگ اُتنی ہی تیز ہوگی۔ شیعہ' سُنّی مفاہمت ممکن نہیں رہے گی۔ بلوچستان کو امن کا گہوارہ بنانا خواب ہی رہے گا۔ چھوٹے صوبوں کی پنجاب سے نفرت بڑھتی چلی جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے نعرے نے پاکستان کے قیام کا جواز فراہم کیا تھا اور اسلام ہی کا نفاذ پاکستان کے استحکام کا باعث بن سکتا ہے۔ وما علینا الا البلاغ!oo

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُوْرَۃُ النُّوْر

آیات ۲۷ تا ۳۴

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا
عَلٰٓى اَهْلِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِیْهَآ
اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى یُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ قِیْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ
اَزْكٰى لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ ﴿۲۸﴾ لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا
غَیْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِیْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۲۹﴾ قُلْ
لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا یَصْنَعُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ
وَیَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْیَضْرِبْنَ
بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُیُوْبِهِنَّ ۪ وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآىِٕهِنَّ اَوْ
اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآىِٕهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِیْٓ اِخْوَانِهِنَّ
اَوْ بَنِیْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآىِٕهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِیْنَ غَیْرِ اُولِی
الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِیْنَ لَمْ یَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۪ وَلَا
یَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِیُعْلَمَ مَا یُخْفِیْنَ مِنْ زِیْنَتِهِنَّ ؕ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِیْعًا
اَیُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَاَنْكِحُوا الْاَیَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِیْنَ مِنْ
عِبَادِكُمْ وَاِمَآىِٕكُمْ ؕ اِنْ یَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ یُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ

عَلِیْمٌ ﴿۳۲﴾ وَلْیَسْتَعْفِفِ الَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى یُغْنِیَهُمُ اللّٰهُ مِنْ
فَضْلِهٖ ؕ وَالَّذِیْنَ یَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ
عَلِمْتُمْ فِیْهِمْ خَیْرًا ۖۗ وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اٰتٰىكُمْ ؕ وَلَا تُكْرِهُوْا
فَتَیٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ؕ وَمَنْ
یُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۳۳﴾ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكُمْ
اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ ﴿۳۴﴾

ان آیات میں متعدد ایسے معاشرتی احکام دیے گئے ہیں جو ایک صاف ستھرا انسانی معاشرہ قائم کرنے کے لیے بنیاد فراہم کرتے ہیں‘ جس میں فحاشی اور بے حیائی کے لیے جگہ پانے کا دور دور تک کوئی امکان نہ ہو۔ اس سلسلے میں سورۂ بنی اسرائیل کا یہ حکم بڑا جامع اور بہت بنیادی نوعیت کا ہے: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِیْلًا ﴿۳۲﴾﴾ ’’تم زنا کے قریب بھی مت پھٹکو‘ یہ کھلی بے حیائی ہے اور بہت ہی برا راستہ ہے‘‘۔ اس سے اسلام کا مدعا و منشا واضح ہوتا ہے کہ وہ انسانی معاشرے میں ہر اس فعل اور طریقے کا سدِّ باب کرنا چاہتا ہے جو فواحش کے زمرے میں آتا ہے۔

اس سلسلے میں اسلامی نقطہ نظر کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو الگ الگ جنسوں یعنی عورت اور مرد کی صورت میں پیدا کر کے ایک حکمت اور مقصد کے تحت ان میں سے ہر ایک کے لیے اپنی مخالف جنس میں بے پناہ کشش رکھی ہے۔ یہ کشش یعنی جنسی خواہش ایک ایسا منہ زور گھوڑا ہے جسے ہر وقت لگام دے کر قابو میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اسلام نے ہر ایسا اقدام کیا ہے جو انسان کے جنسی جذبے کو ایک خاص ڈسپلن کا پابند رکھنے میں معاون ہو اور ہر وہ راستہ بند کرنا ضروری سمجھا ہے جس پر چل کر انسان کے لیے جنسی بے راہ روی کی طرف مائل ہونے کا ذرا سا بھی احتمال ہو۔ یہی فکر و فلسفہ اسلام کے معاشرتی نظام کا بنیادی ستون ہے اور اس ستون کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے قرآن میں ایسے جامع اور دور رس قسم کے احکام جاری کیے گئے ہیں جو ایسے معاملات سے متعلق چھوٹی چھوٹی جزئیات تک کا احاطہ کیے نظر آتے ہیں۔ ان میں گھر کی چار دیواری کا تقدس‘ شخصی تخلیے (privacy) کا تحفظ‘ ستر کا التزام‘ پردے کا اہتمام‘ غضِ بصر سے متعلق ہدایات‘ مخلوط محافل و مواقع کی حوصلہ شکنی جیسے احکام و اقدامات شامل ہیں۔

آیت ۲۷ ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِكُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَهْلِهَا ؕ﴾ ''اے ایمان والو! اپنے گھروں کے علاوہ دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو، حتیٰ کہ ان کی رضا معلوم کرلو اور گھر والوں کو سلام کرلو!''

گھر کی چار دیواری کے تقدس اور اس کے مکینوں کے تخلیے (privacy) کے آداب کو ملحوظ رکھنے کے لیے یہ تاکیدی حکم ہے، یعنی کسی کو کسی دوسرے کے گھر میں اُس کی رضامندی اور اجازت کے بغیر داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ اس سلسلے میں اجازت لینے اور رضامندی معلوم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ملاقات کے لیے آنے والا شخص دروازے کے باہر سے اونچی آواز میں ''السلام علیکم'' کہے اور پوچھنے پر اپنی پہچان کرائے تاکہ اہلِ خانہ اُسے اندر آنے کی اجازت دینے یا نہ دینے کے بارے میں فیصلہ کرسکیں۔ ایسا ہرگز نہ ہو کہ کوئی کسی کے گھر میں بے دھڑک چلا آئے۔

﴿ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝۲۷﴾ ''یہ تمہارے لیے بہتر ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔''

آیت ۲۸ ﴿فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِیْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰی یُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ﴾ ''پھر اگر تم اس گھر میں کسی کو موجود نہ پاؤ تو اس میں داخل نہ ہو یہاں تک کہ تمہیں اجازت دے دی جائے''

گویا خالی گھر میں بھی اس کے مالک کی اجازت کے بغیر داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔

﴿وَاِنْ قِیْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰی لَكُمْ ؕ﴾ ''اور اگر تم سے کہا جائے کہ لوٹ جاؤ تو تم لوٹ جایا کرو، یہ طریقہ تمہارے لیے بہت پاکیزہ ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ ۝۲۸﴾ ''اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس سے خوب واقف ہے۔''

آپ کسی سے ملاقات کا وقت طے کیے بغیر اس کے گھر پہنچ گئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آپ کو وقت دینا اس کا فرض ہے، حالانکہ ممکن ہے اس وقت وہ صاحب آرام کر رہے ہوں، کسی دوسرے کام میں مصروف ہوں یا کسی مجبوری کے باعث آپ سے ملاقات کرنے سے معذور ہوں۔ چنانچہ اگر اندر سے اطلاع دی جائے کہ صاحبِ خانہ کے لیے اس وقت آپ سے

ملاقات کرنا ممکن نہیں اور یہ کہ آپ پھر کسی وقت تشریف لائیں تو ایسی صورت میں آپ بغیر برا مانے واپس چلے جائیں۔ آپ کو ایسے ریمارکس دینے کا کوئی حق نہیں پہنچتا کہ بہت متکبر شخص ہے، میں اس سے ملنے گیا تو اس نے ملاقات سے ہی انکار کردیا۔ البتہ ایسی کسی بھی صورت حال سے بچنے کے لیے بہتر ہے کہ آپ پیشگی اطلاع دے کر اور وقتِ ملاقات طے کر کے کسی سے ملنے کے لیے جائیں۔

آیت ۲۹ ﴿لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِیْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ؕ﴾ ''اس میں تمہارے لیے کوئی حرج نہیں کہ تم غیر رہائشی گھروں میں (بغیر اجازت) چلے جاؤ، جن میں تمہارے لیے کچھ سامان ہو۔''

اس سے مراد دکانیں، سٹور اور گودام وغیرہ ہیں۔

﴿وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ۝۲۹﴾ ''اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو۔''

قانون کی اصل روح کو سمجھنا اور اس کے مطابق اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔ دراصل گھر میں بلا اجازت داخل ہونے سے منع کرنے کا مقصد گھر میں سکونت پذیر خاندان کی privacy کے تقدس کو یقینی بنانا ہے۔ لہٰذا کسی دکان یا گودام پر اس قانون کے اطلاق کا کوئی جواز نہیں ہے کہ آدمی دکان کے دروازے پر اس لیے کھڑا رہے کہ جب تک مالک مجھے اجازت نہیں دے گا میں اندر نہیں جاؤں گا۔

آیت ۳۰ ﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) مؤمنین سے کہیے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔''

﴿ذٰلِكَ اَزْكٰی لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا یَصْنَعُوْنَ ۝۳۰﴾ ''یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے۔ یقیناً اللہ باخبر ہے اُس سے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔''

آیت ۳۱ ﴿وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَیَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ﴾ ''اور مؤمن عورتوں سے بھی کہہ دیجیے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں''

﴿وَلَا يُبۡدِيۡنَ زِيۡنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنۡهَا﴾ ’’اور وہ اپنی زینت کا اظہار نہ کریں‘ سوائے اس کے جو اس میں سے از خود ظاہر ہو جائے‘‘

﴿وَلۡيَضۡرِبۡنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوۡبِهِنَّ ۖ﴾ ’’اور چاہیے کہ وہ اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیوں کے بُکّل مار لیا کریں‘‘

اپنے معمول کے لباس کے اوپر وہ اپنی اوڑھنیوں کو اس طرح لپیٹے رکھیں کہ ان کے گریبان اور سینے ڈھکے رہیں۔ خُمُر جمع ہے‘ اس کا واحد خِمار ہے اور اس کے معنی اوڑھنی (دوپٹہ) کے ہیں۔ سورۃ الاحزاب‘ آیت ۵۹ میں خواتین کے لباس کے حوالے سے جَلابِیب کا لفظ آیا ہے جس کی واحد جِلباب ہے۔ ہمارے ہاں ’’جِلباب‘‘ کا مترادف لفظ چادر ہے۔ چنانچہ یوں سمجھئے کہ دوپٹہ اور چادر دونوں ہی عورت کے لباس کا لازمی حصہ ہیں۔ عرب تمدن میں اسلام سے پہلے اگرچہ عورت کے لیے چہرے کا پردہ رائج نہیں تھا مگر چادر اور اوڑھنی اس دور میں بھی عورت کے لباس کا لازمی حصہ تھیں۔ اوڑھنی وہ ہر وقت اوڑھے رہتی تھی (گھر کے اندر رہتے ہوئے بھی) جبکہ گھر سے باہر نکلنا ہوتا تو چادر اوڑھ کر نکلتی تھی۔ البتہ وہ اوڑھنی اس انداز سے لیتی تھیں کہ گریبان کا ایک حصہ کھلا رہتا تھا جس سے گلا اور سینہ صاف نمایاں ہوتا تھا۔ اس آیت میں حکم دیا گیا کہ اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیوں کے بُکّل مار لیا کریں تاکہ ان کے گریبان اور سینے اچھی طرح ڈھکے رہیں۔ زمانہ قبل از اسلام میں عربوں کے ہاں چادر نہ صرف عورتوں بلکہ مردوں کے لباس کا بھی لازمی حصہ تھی۔ چادر مرد کی عزت کی علامت سمجھی جاتی اور چادر کے معیار سے کسی شخص کے مقام و مرتبے کا تعین بھی ہوتا تھا۔ معمولی چادر والے شخص کو ایک عام آدمی جبکہ قیمتی دوشالہ اوڑھنے والے کو معزز اور اہم آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح کسی کے کاندھے سے اس کی چادر کا کھینچنا یا گھسیٹنا اس کو بے عزت و بے توقیر کرنے کی علامت تھی۔ چادر کا یہی تصور اس حدیث قدسی میں بھی ملتا ہے جس میں حضورﷺ نے فرمایا کہ اللہ فرماتا ہے: ((اَلۡكِبۡرِيَاءُ رِدَائِيۡ))(۱) ’’تکبر میری چادر ہے‘‘۔ یعنی جو شخص تکبر کرتا ہے وہ گویا میری چادر گھسیٹ رہا ہے۔

﴿وَلَا يُبۡدِيۡنَ زِيۡنَتَهُنَّ﴾ ’’اور وہ نہ ظاہر کریں اپنی زینت کو‘‘

آگے اس حکم سے استثناء کے طور پر مردوں کی ایک طویل فہرست دی جا رہی ہے جن

(۱) سنن ابی داوٗد‘ کتاب اللباس‘ باب ما جاء فی الکبر‘ عن ابی هريرة ؓ۔

کے سامنے عورت بغیر حجاب‘ کھلے چہرے کے ساتھ آسکتی ہے۔ مقامِ غور ہے کہ اگر عورت کے چہرے کا پردہ لازمی نہیں ہے تو محرم مَردوں کی یہ طویل فہرست بیان فرمانا (معاذ اللہ!) کیا ایک بے مقصد مشق (excercise in futility) ہے؟ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی شریعت میں عورت کے چہرے کا پردہ لازمی ہے اور اس حکم سے جن مردوں کو استثناء حاصل ہے وہ یہ ہیں:

﴿اِلَّا لِبُعُوۡلَتِهِنَّ اَوۡ اٰبَآئِهِنَّ﴾ ’’(وہ اپنی زینت ظاہر نہ کریں کسی پر) سوائے اپنے شوہروں کے یا اپنے باپوں کے‘‘

باپ کے مفہوم میں چچا‘ ماموں‘ دادا اور نانا بھی شامل ہیں۔

﴿اَوۡ اٰبَآءِ بُعُوۡلَتِهِنَّ اَوۡ اَبۡنَآئِهِنَّ اَوۡ اَبۡنَآءِ بُعُوۡلَتِهِنَّ﴾ ’’یا اپنے شوہروں کے باپوں کے‘ یا اپنے بیٹوں کے‘ یا اپنے شوہروں کے بیٹوں کے‘‘

یعنی شوہر کا وہ بیٹا جو اس کی دوسری بیوی سے ہے وہ بھی نامحرم نہیں ہے۔

﴿اَوۡ اِخۡوَانِهِنَّ اَوۡ بَنِيۡۤ اِخۡوَانِهِنَّ اَوۡ بَنِيۡۤ اَخَوٰتِهِنَّ﴾ ’’یا اپنے بھائیوں کے‘ یا اپنے بھائیوں کے بیٹوں (بھتیجوں) کے‘ یا اپنی بہنوں کے بیٹوں (بھانجوں) کے‘‘

﴿اَوۡ نِسَآئِهِنَّ﴾ ’’یا اپنی (جان پہچان کی) عورتوں کے‘‘

یعنی عام عورتیں بھی نامحرم تصور کی جائیں گی۔ البتہ اپنے میل جول اور جان پہچان کی عورتیں اس استثنائی فہرست میں شامل ہیں۔

﴿اَوۡ مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُهُنَّ﴾ ’’یا اُن کے جن کے مالک ہیں ان کے داہنے ہاتھ‘‘

یعنی غلام اور لونڈیاں۔ لیکن اکثر اہل سنت علماء کے نزدیک یہ حکم صرف لونڈیوں کے لیے ہے اور غلام اس میں شامل نہیں ہیں۔

﴿اَوِ التّٰبِعِيۡنَ غَيۡرِ اُولِى الۡاِرۡبَةِ مِنَ الرِّجَالِ﴾ ’’یا ایسے زیر دست مَردوں کے جو اس طرح کی غرض نہیں رکھتے‘‘

یعنی ایسے زیر دست لوگ جو صرف خدمت گار ہوں اور اپنی عمر یا زیر دستی و محکومی کی بنا پر خواتین خانہ کے متعلق کوئی بری نیت دل میں نہ لا سکیں۔ اس شرط پر پورا اترنے والے مرد بھی اس استثنائی فہرست میں شمار ہوں گے۔ مثلاً ایسے خاندانی ملازمین جو کئی پشتوں سے گھریلو

خدمت پر مامور ہوں۔ پہلے باپ ملازم تھا' پھر اس کا بیٹا بھی اسی گھر میں پلا بڑھا اور بچپن سے ہی گھر کی خواتین کی خدمت میں رہا۔ ایسے لڑکے یا مرد سے یہ اندیشہ نہیں ہوتا کہ وہ گھر کی خواتین کے بارے میں برا خیال ذہن میں لائے۔

﴿اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۪﴾ ''یا اُن لڑکوں کے جو عورتوں کے مخفی معاملات سے ابھی ناواقف ہیں''

یعنی وہ نابالغ لڑکے جن میں عورتوں کے لیے فطری رغبت ابھی پیدا نہیں ہوئی۔ یہ ان محرم لوگوں کی فہرست ہے جن کے سامنے عورت بغیر حجاب کے آ سکتی ہے۔ اس ضمن میں دو باتیں مزید ذہن نشین کر لیجیے:

پہلی یہ کہ اس آیت میں اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا (سوائے اس کے جو اس میں سے از خود ظاہر ہو جائے) کے الفاظ سے بعض لوگ چہرہ مراد لیتے ہیں' جو بالبداہت بالکل غلط ہے۔ سورۃ الاحزاب میں وارد احکامِ حجاب اور احادیث نبویہ کی رو سے عورت کے لیے چہرے کا پردہ لازمی ہے۔ عہدِ نبویؐ میں حکم حجاب آ جانے کے بعد عورتیں کھلے منہ نہیں پھرتی تھیں۔ میرے نزدیک ان قرآنی الفاظ سے مراد نسوانی جسم کی ساخت یا اس کی ایسی کوئی کیفیت ہے جسے عورت چھپانا چاہے بھی تو نہیں چھپا سکتی۔ مثلاً کسی خاتون نے برقعہ پہن رکھا ہے' چہرے کے پردے کا اہتمام بھی کیا ہے مگر اس کے لمبے قد کی کشش یا متناسب جسم کی خوبصورتی اس سب کچھ کے باوجود بھی اپنی جگہ موجود ہے' جو بہرحال چھپائے نہیں چھپ سکتی۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ مذکورہ محرموں کے سامنے عورت کو صرف چہرے کے پردے کے بغیر آنے کی اجازت ہے۔ ستر کے کسی حصے کو ان کے سامنے بھی کھولنے کی اسے اجازت نہیں (اس میں صرف اس کے خاوند کو استثناء حاصل ہے)۔ واضح رہے کہ عورت کے چہرے' پہنچوں سے نیچے ہاتھوں اور ٹخنوں سے نیچے پیروں کے سوا اس کا تمام جسم اس کے ستر میں شامل ہے۔ چنانچہ کسی عورت کو کھلے بالوں کے ساتھ یا مذکورہ تین اعضاء کے علاوہ جسم کے کسی حصے کو کھلا چھوڑ کر اپنے والد' بھائی یا بیٹے کے سامنے بھی آنے کی اجازت نہیں۔

﴿وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ؕ﴾ ''اور وہ اپنے پاؤں زمین پر مار کر نہ چلیں کہ ان کی اس زینت میں سے کچھ ظاہر ہو جائے جسے وہ چھپاتی ہیں۔''

عورت کی چال ایسی نہ ہو جس کی وجہ سے چادر یا برقعے کے باوجود اس کے بناؤ سنگھار' زیورات وغیرہ میں سے کسی قسم کی زینت کے اظہار کا امکان ہو۔

﴿وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿٣١﴾﴾ ''اور اے اہلِ ایمان! تم سب کے سب مل کر اللہ کی جناب میں توبہ کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔''

آیت ۳۲ ﴿وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ﴾ ''اور نکاح کر دیا کرو بیواؤں کا اپنے میں سے''

یہ بہت اہم حکم ہے۔ خصوصی طور پر ہمارے اس معاشرے کے لیے اس میں بہت بڑی راہنمائی ہے جہاں ہندوانہ رسم و رواج کے اثرات کے باعث بیوہ کا نکاح کرنا معیوب اور ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ خوشی سے کوئی شخص بھی نکاح نہیں کرنا چاہتا۔

﴿وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ؕ﴾ ''اور تمہارے غلاموں اور باندیوں میں سے جو ذی صلاحیت ہوں''

تمہارے غلاموں اور باندیوں میں سے جو سمجھ دار ہوں اور ان کے کردار کے بارے میں بھی تمہیں اعتماد ہو ان کے آپس میں نکاح کر دیا کرو۔ غلاموں اور کنیزوں کے نکاح ان کے آقاؤں کی اجازت سے ہوں گے اور جب کسی کنیز کا نکاح ہو جائے گا تو پھر اس کے آقا کو اُس کے ساتھ تمتع کی اجازت نہیں ہوگی۔

﴿اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ﴾ ''اگر وہ تنگ دست ہوں گے تو اللہ انہیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔''

چنانچہ یہ اندیشہ نہیں ہونا چاہیے کہ ان میں مہر وغیرہ ادا کرنے کی استطاعت نہیں تو نکاح کیونکر کریں!

﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٣٢﴾﴾ ''اور اللہ بہت وسعت والا' سب کچھ جاننے والا ہے۔''

وہ بہت کشادگی والا ہے اور اپنے بندوں کے احوال واقعی سے بخوبی واقف بھی ہے۔ اس سے یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ کوئی انسان اپنی تنگ دستی کو اپنے نکاح کے راستے کی رکاوٹ نہ سمجھے۔ اسے امید رکھنی چاہیے کہ اس کی بیوی اپنی قسمت اور اپنا رزق اپنے ساتھ لے کر آئے گی اور یہ کہ نکاح کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے فضل خاص سے اس کے لیے رزق کا کوئی نیا دروازہ کھول دے گا۔

آیت ۳۳ ﴿وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا﴾ ''اور خود کو بچائے رکھیں وہ لوگ

جونکاح کی قدرت نہ پائیں‘‘

جولوگ نکاح کرنے کی بالکل استطاعت نہ رکھتے ہوں‘ یعنی ان کے پاس نہ تو مہر ادا کرنے کے لیے کچھ ہو‘ نہ نان نفقہ کے لیے کوئی ذریعہ معاش ہو اور نہ ہی سر چھپانے کے لیے کسی قسم کی چھت کا بندوبست‘ تو ایسے لوگوں کو چاہیے کہ اپنی عفت وعصمت کی حفاظت کرتے رہیں اور اپنی خواہشات کو اپنے قابو میں رکھیں۔

﴿حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ﴾ ’’یہاں تک کہ اللہ انہیں اپنے فضل سے غنی کردے۔‘‘

﴿وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ ’’اور جو مکاتبت کرنا چاہیں تمہارے مملوکوں میں سے‘‘

آقا اور غلام کے درمیان آزادی کے معاہدے کو مکاتبت کہا جاتا ہے۔ یہ معاہدہ غلام کی خواہش اور آقا کی رضامندی سے طے پاتا تھا کہ آقا اگر اپنے غلام کو آزاد کردے تو وہ ایک مقررہ مدت تک طے شدہ رقم اپنے آقا کو معاوضے کے طور پر ادا کرے گا۔

﴿فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ۖ﴾ ’’تو اُن سے مکاتبت کرلیا کرو‘ اگر تم سمجھو کہ ان میں بھلائی ہے‘‘

اگر تم میں سے کسی کو اپنے غلام پر اعتماد ہو کہ وہ اپنا معاہدہ پورا کرے گا اور بھاگنے کی کوشش نہیں کرے گا تو اسے ضرور ایسا معاہدہ کرلینا چاہیے۔ اس حکم سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن نے ہر اس اقدام کی حوصلہ افزائی کی ہے اور ہر وہ راستہ کھولنے کا اہتمام کیا ہے جس سے تدریجاً غلاموں کو آزادی میسر آئے اور غلامی کا خاتمہ ہوسکے۔

﴿وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ؕ﴾ ’’اور ان کو اس مال میں سے دو جو اللہ نے تمہیں دیا ہے‘‘

یعنی جن غلاموں نے مکاتبت کی ہو تم لوگ اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے ان کی زیادہ سے زیادہ مالی معاونت کیا کرو تاکہ وہ جلد از جلد مقررہ رقم ادا کرکے آزاد ہوسکیں۔

﴿وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا﴾ ’’اور اپنی باندیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کیا کرو جبکہ وہ خود پاک دامن رہنا چاہیں‘‘

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر وہ خود پاک دامن نہ رہنا چاہتی ہوں تو ان کو مجبور کرنے کی اجازت ہے۔ ’’اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا‘‘ کی قید یہاں بطور شرط کے نہیں بلکہ صورتِ واقعہ کی تعبیر کے لیے ہے۔

﴿لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ﴾ ’’تاکہ تم حاصل کرو دنیا کی زندگی کا سامان۔‘‘

عربوں کے ہاں یہ بھی رواج تھا کہ وہ اپنی باندیوں سے پیشہ کرواتے اور اس سے حاصل ہونے والی کمائی خود کھاتے تھے۔ چنانچہ اس حکم سے زمانہ جاہلیت کی اس شرمناک روایت کو بھی ختم کردیا گیا۔ اسی طرح قبل از اسلام عربوں میں ایک رواج یہ بھی تھا کہ وہ اپنے باپ کی بیواؤں یعنی سوتیلی ماؤں سے بھی نکاح کرلیا کرتے تھے۔ اس قبیح رسم کے خاتمے کا حکم سورۃ النساء کی آیت ۲۲ میں دیا گیا ہے۔ گویا قبل از اسلام عرب معاشرے میں جو معاشرتی برائیاں پائی جاتی تھیں ایک ایک کرکے ان کی اصلاح کردی گئی۔

﴿وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۳﴾﴾ ’’اور اگر کوئی انہیں مجبور کرے گا تو یقیناً اللہ ان کے جبر کے بعد بہت بخشنے والا‘ بہت رحم کرنے والا ہے۔‘‘

اگر کوئی اپنی باندی کو بدکاری پر مجبور کرے گا اور خود اس باندی کی مرضی اس میں شامل نہیں ہوگی تو اللہ تعالیٰ اس کی مجبوری کے باعث اس کے گناہ کو معاف فرمادے گا اور اس گناہ کا وبال اس پر ہوگا جس نے اسے اس کام کے لیے مجبور کیا ہوگا۔

آیت ۳۴ ﴿وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ ’’اور ہم نے نازل کردی ہیں تمہاری طرف یہ روشن آیات اور ان لوگوں کے احوال بھی جو تم سے پہلے تھے‘‘

جو لوگ تم سے پہلے ہوگزرے ہیں انہوں نے جو غلط عقائد گھڑ رکھے تھے اور ان کے اندر جو جو معاشرتی برائیاں پائی جاتی تھیں ہم نے ان سب کی نشان دہی بھی اس کتاب میں کردی ہے۔

﴿وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۴﴾﴾ ’’اور اہلِ تقویٰ کے لیے نصیحت بھی۔‘‘

سورۂ یونس کی آیت ۵۷ میں بھی قرآن کو موعظہ (نصیحت) قرار دیا گیا ہے:

﴿قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ ’’آ گئی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے۔‘‘

آیات ۳۵ تا ۴۰

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ
اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ
مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ
نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ
لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۙ﴿۳۵﴾ فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ
فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۙ﴿۳۶﴾ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ
وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ
فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۙ﴿۳۷﴾ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ
فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ
كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا
وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۳۹﴾ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ
بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا
فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا
فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴿۴۰﴾

یہ اس سورت کا پانچواں رکوع ہے جو اپنے مضامین کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے دوسرے حصے میں ایمان کی بحث کے ضمن میں ایک اہم درس (درس ۷) اس رکوع پر مشتمل ہے۔ اس رکوع کی پہلی آیت (آیت ۳۵) قرآن مجید کی عظیم ترین آیات میں سے ہے۔ سورۃ الاحزاب اور سورۃ النور کا آپس میں جوڑا ہونے کا تعلق ہے۔ ان دونوں سورتوں کے درمیان بہت سی دوسری مناسبتوں اور مشابہتوں کے علاوہ ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ سورۃ الاحزاب کی آیت ۳۵ بھی اسی موضوع پر ہے، یعنی ایمان اور اسلام کی کیفیات کے حوالے سے یہ دونوں آیات قرآن مجید کی عظیم ترین آیات میں سے ہیں۔

اس رکوع میں ایمان کے حوالے سے انسانوں کی تین اقسام زیر بحث آئی ہیں۔ اس سے پہلے سورۃ البقرۃ کے آغاز میں بھی دعوتِ حق کے ردِعمل کے حوالے سے تین قسم کے انسانوں کا ذکر ہو چکا ہے۔ دراصل دین کی دعوت اور اسلامی تحریک کے جواب میں کسی بھی معاشرے کے اندر عام طور پر تین طرح کا ردعمل سامنے آتا ہے۔ کچھ لوگ تو نتائج وعواقب سے بے پروا ہو کر اس دعوت پر دل و جان سے لبیک کہتے ہیں اور پھر اپنے عمل سے اپنے ایمان اور دعویٰ کی سچائی ثابت بھی کر دکھاتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں کچھ لوگ دوسری انتہا پر ہوتے ہیں۔ وہ تعصّب، حسد، ضد اور تکبر کی وجہ سے انکار اور مخالفت پر کمر کس لیتے ہیں اور آخر دم تک اس پر ڈٹے رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ معاشرے میں ایک تیسری قسم کے لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ پورے یقین اور خلوص کے ساتھ اس دعوت کو قبول بھی نہیں کرتے اور کچھ دُنیوی مفادات اور متفرق وجوہات کے پیشِ نظر مکمل طور پر اسے رد بھی نہیں کرتے۔ جب حالات کچھ سازگار ہوں تو اہلِ حق کا ساتھ دینے کے لیے تیار بھی ہو جاتے ہیں، لیکن جونہی کوئی آزمائش آتی ہے یا قربانی کا تقاضا سامنے آتا ہے تو فوراً اپنی راہ الگ کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی دلی کیفیات اور کردار کا نقشہ سورۃ الحج کی آیت ۱۱ میں یوں کھینچا گیا ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۱﴾﴾ ''اور لوگوں میں سے کوئی وہ بھی ہے جو اللہ کی عبادت کرتا ہے کنارے پر رہ کر، تو اگر اسے کوئی فائدہ پہنچے تو اس کے ساتھ مطمئن رہے اور اگر اسے کوئی آزمائش آ جائے تو منہ کے بل الٹا پھر جائے۔ یہ خسارہ ہے دنیا اور آخرت کا، یہ بہت ہی بڑی تباہی ہے۔''

زیر مطالعہ آیات میں ایک دوسرے زاویے سے معاشرے کے تین کرداروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں پہلی قسم ایسے سلیم الفطرت انسانوں کی ہے جن کے دلوں میں اللہ کی معرفت فطری طور پر پائی جاتی ہے۔ پھر جب وحی کے پیغام تک ان کی رسائی ہوتی ہے تو وہ اس کے فیوض و برکات سے بھی بہترین انداز میں مستفیض ہوتے ہیں۔ نتیجتاً ان کا باطن ایمانِ حقیقی کے نور سے جگمگا اٹھتا ہے۔ ایسے لوگوں کی اس کیفیت کو یہاں ''نُورٌ عَلٰی نُور'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسری انتہا پر وہ لوگ ہیں جن کے دل نورِ ایمان سے محروم ہیں۔ وہ خالص دنیا پرست انسان ہیں جن کے دامن جھوٹ موٹ کی نیکیوں سے بھی خالی ہیں۔ ان کے دلوں میں زندگی بھر نفسانی خواہشات کے علاوہ کسی اور خیال اور جذبے کا گزر تک نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کی اس

کیفیت کا نقشہ ’’ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ‘‘ کے الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔ ان دو انتہاؤں کے درمیان ایک تیسرا کردار بھی ہے‘ جس کا ذکر یہاں کیا گیا ہے۔ اس کردار کے حامل وہ لوگ ہیں جن کے دل اگرچہ حقیقی ایمان سے محروم ہیں‘ لیکن وہ اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے یا دُنیوی اغراض و مقاصد کے لیے نیکی کے کام بھی کرتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے نیک اعمال کو یہاں سراب سے تشبیہہ دی گئی ہے۔

آیت ۳۵ ﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ’’اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا۔‘‘

﴿مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ﴾ ’’اُس کے نور کی مثال ایسے ہے جیسے ایک طاق‘‘

نور سے مراد یہاں نورِ ایمان ہے‘ یعنی اللہ پر ایمان کے نور کی مثال ایک طاق کی سی ہے:

﴿فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ﴾ ’’اس (طاق) میں ایک روشن چراغ ہے‘ وہ چراغ شیشے (کے فانوس) میں ہے۔‘‘

وہ چراغ شیشے کے فانوس میں رکھا گیا ہے‘ جیسے پچھلے زمانے میں شیشے کی چمنیوں میں چراغ رکھے جاتے تھے۔

﴿اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ﴾ ’’اور وہ شیشہ ایک چمکدار ستارے کی مانند ہے‘‘

اس مثال میں انسانی سینے کو طاق اور دل کو چراغ سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ انسانی پسلیوں کا ڈھانچہ‘ جسے ہم سینہ کہتے ہیں‘ یہ نیچے سے چوڑا اور اوپر سے تنگ ہونے کی وجہ سے پرانے زمانے کے طاق سے مشابہت رکھتا ہے۔ ڈایافرام (diaphragm) جو نچلے دھڑ کے اندرونی حصے (abdominal cavity) کو سینے کے اندرونی حصے (chest cavity) سے علیحدہ کرتا ہے اس طاق کا گویا فرش ہے جس کے اوپر یہ چراغ یعنی دل رکھا گیا ہے۔ یہ دل ایک بندۂ مؤمن کا دل ہے جو نورِ ایمان سے جگمگا رہا ہے۔ یہ نورِ ایمان مجموعہ ہے نورِ فطرت (جو اس کی روح کے اندر پہلے سے موجود تھا) اور نورِ وحی کا۔

﴿يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ﴾ ’’وہ (چراغ) جلایا جاتا ہے زیتون کے ایک مبارک درخت سے‘ جو نہ شرقی ہے اور نہ غربی‘‘

کسی درخت پر جس سمت سے دھوپ پڑتی ہو‘ اسی سمت کے حوالے سے وہ شرقی یا غربی کہلاتا ہے۔ اگر کوئی درخت کسی اوٹ میں ہو یا درختوں کے جھنڈ کے اندر ہو تو اس پر صرف

ایک سمت سے ہی دھوپ پڑ سکتی ہے۔ اس لحاظ سے ایسا درخت یا شرقی ہوگا یا غربی۔ لیکن یہاں ایک مثالی درخت کی مثال دی جا رہی ہے جو نہ شرقی ہے اور نہ غربی۔ وہ نہ تو کسی اوٹ میں ہے اور نہ ہی درختوں کے جھنڈ میں‘ بلکہ وہ کھلے میدان میں بالکل یکہ و تنہا کھڑا ہے اور پورے دن کی دھوپ مسلسل اس پر پڑتی ہے۔ اس مضمون کی اہمیت یہ ہے کہ زیتون کا وہ درخت جس پر زیادہ سے زیادہ دھوپ پڑتی ہو اور مشرق و مغرب دونوں سمتوں سے پڑتی ہو‘ اس کے پھلوں کا روغن بہت صاف‘ شفاف اور اعلیٰ معیار کا ہوتا ہے۔

﴿يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ﴾ ’’قریب ہے کہ اُس کا روغن (خود بخود) روشن ہو جائے‘ چاہے اسے آگ نے ابھی چھوا بھی نہ ہو۔‘‘

گویا وہ آگ کے چھوئے بغیر ہی بھڑک اٹھنے کے لیے تیار ہے۔

﴿نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ﴾ ’’روشنی پر روشنی!‘‘

یعنی جب اسے آگ دکھائی جائے تو وہ بھڑک اٹھتا ہے اور نورٌ علیٰ نور کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ خوبصورت مثال ایمان کے اجزائے ترکیبی کے بارے میں ہے اور میں نے مختلف مواقع پر اس مثال کی وضاحت بہت تفصیل سے کی ہے۔ اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ فطرتِ انسانی کے اندر اللہ تعالیٰ کی معرفت یا اس پر ایمان کی کیفیت پیدائشی طور پر موجود ہے‘ مگر دنیا میں رہتے ہوئے یہ معرفت ماحول اور حالات کے منفی اثرات کے باعث عام طور پر غفلت اور مادیت کے پردوں میں چھپ کر شعور سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ البتہ کچھ لوگ اس حد تک سلیم الفطرت ہوتے ہیں کہ اُن کے اندر معرفتِ خداوندی خارجی حالات کے تمام تر منفی اثرات کے باوجود بھی مسلسل اجاگر اور فعال رہتی ہے۔

فطری معرفت کی اس روشنی کے بعد انسانی ہدایت کا دوسرا بڑا ذریعہ یا منبع وحی الٰہی ہے۔ وحی کے ذریعہ حاصل ہونے والی ہدایت بنیادی طور پر انسانی فطرت کے اندر پہلے سے موجود غیر فعال اور خوابیدہ (dormant) ایمان اور معرفت خداوندی کو بیدار اور فعال (activate) کرنے میں مدد دیتی ہے۔ چنانچہ جب وحی کا پیغام لوگوں تک پہنچتا ہے تو اس پر ہر انسان کا ردِعمل اس کی فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر کسی انسان کی فطرت میں تکدر ہے تو وہ وحی کے اس پیغام کی طرف فوری طور پر متوجہ نہیں ہوتا۔ ایسے شخص کی فطرت کی کثافت کو دور

کرنے اور اس کے اندر فطری طور پر موجود معرفتِ خداوندی کو غفلت کے پردوں سے نکال کر شعور کی سطح پر لانے کے لیے وقت اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسری طرف ایک سلیم الفطرت انسان وحی کے پیغام کو پہچاننے میں ذرہ بھر تأمل و تاخیر نہیں کرتا۔ فطری معرفت اس کے اندر چونکہ پہلے سے شعوری سطح پر موجود ہوتی ہے اس لیے نورِ وحی جونہی اس کے سامنے آتا ہے اس کے دل کا آئینہ جگمگا اٹھتا ہے اور وہ فوراً اس پیغام کی تصدیق کر دیتا ہے۔ ایسے لوگ پیغامِ وحی کی فوری تصدیق کی وجہ سے ''صِدّیقین'' کہلاتے ہیں۔ اس حوالے سے نبی مکرم ﷺ کا یہ فرمان بھی ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ: ''میں نے جس کسی کو بھی ایمان کی دعوت دی اس نے کچھ نہ کچھ توقف یا تردّد ضرور کیا' سوائے ابوبکرؓ کے' جنہوں نے ایک لمحے کا بھی توقف نہیں کیا''۔ سورۃ التوبہ کی آیت ۱۰۰ میں جن خوش نصیب لوگوں کو: ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ﴾ کا خطاب ملا' یہ وہی لوگ تھے جن کی فطرت کے آئینے غیر معمولی طور پر شفّاف تھے۔ دوسری طرف اسی ماحول میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کی فطرت کے تکدّر کو دور کرنے کے لیے اضافی وقت اور محنت کی ضرورت پڑی۔ ایسے لوگ بعد میں اپنی اپنی طبیعت کی کیفیت اور استطاعت کے مطابق ''سابقون الاولون'' کی پیروی کرنے والوں کی صف میں شامل ہوتے رہے۔ ان لوگوں کا ذکر اسی آیت میں ﴿وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ﴾ کے الفاظ میں ہوا ہے۔

آیت زیرِ مطالعہ میں دی گئی مثال کو سمجھنے کے لیے تیل کی مختلف اقسام کے فرق کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ پرانے زمانے میں تیل کے دیے جلائے جاتے تھے۔ ہمارے ہاں عام طور پر ان میں سرسوں کا تیل جلایا جاتا تھا۔ یہ تیل زیادہ کثیف ہونے کی وجہ سے دیا سلائی دکھانے پر بھی آگ نہیں پکڑ سکتا۔ چنانچہ اسے کپڑے یا روئی کے فتیلے (بتی) کی مدد سے جلایا جاتا تھا۔ اس کے مقابلے میں پٹرول بھی ایک تیل ہے جو جلنے کے لیے ہر وقت بیتاب رہتا ہے اور چھوٹی سی چنگاری بھی اگر اس کے قریب آجائے تو بھڑک اٹھتا ہے۔ جلنے کے اعتبار سے جس طرح کڑوے تیل اور پٹرول میں فرق ہے اسی نوعیت کا فرق انسانی طبائع میں بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ مثال میں اعلیٰ قسم کے زیتون سے حاصل شدہ انتہائی شفاف تیل گویا ''صدیقین'' کی فطرتِ سلیم ہے جو وحی الٰہی کے نور سے مستفیض ہونے اور ''نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ'' کی کیفیت کو پانے کے لیے ہر وقت بے تاب و بے چین رہتی ہے۔ گویا انسانی روح ایک نورانی یا ملکوتی چیز ہے۔ اس ملکوتی روح سے جب وحی یا قرآن کے نور کا اتصال ہوتا ہے تو نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور اسی کیفیت سے نورِ ایمان وجود میں آتا ہے' جس سے بندۂ مؤمن کا

دل منور ہوتا ہے۔

﴿يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ﴾ ''اللہ ہدایت دیتا ہے اپنے نور کی جس کو چاہتا ہے۔''

﴿وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۳۵﴾ ''اور اللہ یہ مثالیں بیان کرتا ہے لوگوں (کی راہنمائی) کے لیے' جبکہ اللہ تو ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔''

یہ مثال لوگوں کو سمجھانے کے لیے بیان کی گئی ہے' کیونکہ انسانی ذہن ایسے لطیف حقائق کو براہِ راست نہیں سمجھ سکتا —— اب آئندہ آیات میں ان لوگوں کے کردار و عمل کی جھلک دکھائی جا رہی ہے جن کے دل نورِ ایمان سے منور ہوتے ہیں۔

آیت ۳۶ ﴿فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ﴾ ''(اُس کے نور کی طرف ہدایت پانے والے) ان گھروں میں (پائے جاتے ہیں) جن کے متعلق اللہ نے حکم دیا ہے کہ ان کو بلند کیا جائے اور ان میں اس کا نام لیا جائے''

ان گھروں سے مراد مساجد ہیں اور انہیں بلند کرنے کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ مساجد کی تعمیر اس انداز اور ایسی جگہوں پر کی جائے کہ وہ پوری آبادی میں بہت نمایاں اور مرکزی حیثیت کی حامل ہوں اور دوسرے یہ کہ ان کے معنوی ترفّع کو یقینی بنایا جائے اور ہر قسم کی معنوی نجاست سے انہیں پاک رکھا جائے۔

﴿يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۝۳۶﴾ ''وہ تسبیح کرتے ہیں اللہ کی ان (مساجد) میں صبح اور شام۔''

یہ صاحبِ ایمان لوگ جن کے دلوں میں نورِ ایمان کی قندیلیں روشن ہیں وہ اللہ کے ان گھروں میں صبح و شام اُس کا ذکر اور اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں۔

آیت ۳۷ ﴿رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاۗءِ الزَّكٰوةِ ۙ﴾ ''وہ جواں مرد جنہیں غافل نہیں کرتی کسی قسم کی کوئی تجارت یا خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے' نماز قائم کرنے سے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے''

﴿يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۝۳۷﴾ ''(اس سب کچھ کے

باوجود بھی) وہ لرزاں وترساں رہتے ہیں اُس دن کے تصور سے جس دن الٹ جائیں گے دل اور نگاہیں۔''

آیت ۳۸ ﴿لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ﴾ ''تاکہ اللہ انہیں بہترین جزا دے ان کے اعمال کی اور ان کو اپنے فضل سے مزید نوازے۔''

﴿وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۸﴾﴾ ''اور اللہ جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے بغیر حساب کے۔''

یہ تو تھی ایک مؤمن صادق کے دل اور اس کی کیفیت ایمان کے بارے میں تمثیل اور اس کے کردار کی ایک جھلک۔ اب اگلی دو آیات میں اُن لوگوں کے اعمال کے بارے میں دو تمثیلیں بیان کی گئی ہیں جن کے دل ایمانِ حقیقی کی روشنی سے یکسر خالی ہیں مگر وہ اپنے دل کی تسلی اور اپنے ضمیر کے اطمینان کے لیے نیکی کے مختلف کام سرانجام دیتے رہتے ہیں۔ ان تمثیلوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کی نیکیاں اللہ کے ہاں قابلِ قبول نہیں ہیں۔ ان آیات کا مطالعہ کرتے ہوئے سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷ (آیت البِر) کے الفاظ اور ان الفاظ کا مفہوم ایک دفعہ اپنے ذہن میں پھر سے تازہ کرلیں:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾﴾

''نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف پھیر لو' بلکہ نیکی تو اُس کی ہے جو ایمان لائے اللہ پر' یومِ آخرت پر' فرشتوں پر' کتابوں پر اور نبیوں پر۔ اور وہ مال خرچ کرے اس (مال) کی محبت کے باوجود' قرابت داروں' یتیموں' محتاجوں' مسافروں اور مانگنے والوں پر اور گردنوں کے چھڑانے میں' اور قائم کرے نماز اور ادا کرے زکوٰۃ' اور جو پورا کرنے والے ہیں اپنے عہد کو جب کوئی عہد کرلیں' اور صبر

کرنے والے ہیں فقر و فاقہ میں' تکالیف میں اور جنگ کی حالت میں۔ یہ ہیں وہ لوگ جو سچے ہیں اور یہی حقیقت میں متقی ہیں۔''

اب ملاحظہ کیجیے ایمانِ حقیقی کے بغیر انجام دیے گئے نیک اعمال کی مثال:

آیت ۳۹ ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ﴾ ''اور جو کافر ہیں ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے سراب کسی چٹیل میدان میں' پیاسا اسے پانی سمجھتا ہے۔''

﴿حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ؕ﴾ ''یہاں تک کہ وہ جب اس کے پاس آیا تو اُس نے وہاں کچھ نہ پایا' البتہ اس نے اس کے پاس اللہ کو پایا' تو اس نے پورا پورا چکا دیا اسے اس کا حساب۔''

﴿وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۳۹﴾﴾ ''اور اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔''

یعنی اگر کسی شخص کا دل حقیقی ایمان سے محروم ہے تو خدمت خلق کے میدان میں اس کے کارناموں اور دوسرے نیک کاموں کی اللہ کے نزدیک کوئی وقعت نہیں۔ ایسی نیکیاں تو گویا سراب (دھوکہ) ہیں۔ جیسے صحرا میں ایک پیاسا شخص سراب (چمکتی ہوئی ریت) کو پانی سمجھتا ہے اسی طرح یہ لوگ بھی اپنے اعمال کو نیکیوں کا ڈھیر سمجھتے ہیں' لیکن روزِ حساب ان پر اچانک یہ حقیقت کھلے گی کہ ان کا کوئی عمل بھی اللہ کے ہاں شرفِ قبولیت نہیں پاسکا۔ سورۂ ابراہیم کی آیت ۱۸ میں ایسے لوگوں کے اعمال کو راکھ کے اس ڈھیر سے تشبیہہ دی گئی ہے جو تیز آندھی کی زد میں ہو۔

اس سلسلے کی دوسری مثال ان لوگوں کے بارے میں ہے جن کی زندگیاں ایسی جھوٹ موٹ کی نیکیوں سے بھی خالی ہیں اور ان کے باطن سراسر شہواتِ نفس اور دُنیا پرستی کی گندگی سے بھرے پڑے ہیں:

آیت ۴۰ ﴿اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ﴾ ''یا بہت گہرے سمندر میں اندھیروں کی مانند' اسے ڈھانپ لیتی ہو ایک موج' اس کے اوپر ہو ایک اور موج' اس کے اوپر ہوں بادل''

یعنی اندھیری رات ہے' سمندر کی گہرائی میں موج در موج کی کیفیت ہے اور اوپر فضا

(باقی صفحہ 62 پر)

خطا‘ نسیان اور جبر و اکراہ کی معافی اور دنیا کی بے ثباتی

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

۸/ اگست ۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا ؕ لَھَا مَا کَسَبَتْ وَعَلَیْھَا مَا اکْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِیْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَآ اِصْرًا کَمَا حَمَلْتَہٗ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَۃَ لَنَا بِہٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۟ وَاغْفِرْلَنَا ۟ وَارْحَمْنَآ ۟ اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ﴿۲۸۶﴾﴾ (البقرۃ)

﴿مَنْ کَفَرَ بِاللّٰہِ مِنْۢ بَعْدِ اِیْمَانِہٖٓ اِلَّا مَنْ اُکْرِہَ وَقَلْبُہٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِیْمَانِ وَلٰکِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْکُفْرِ صَدْرًا فَعَلَیْھِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰہِ ۚ وَلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ﴿۱۰۶﴾﴾ (النحل)

﴿وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَۃِ اِلَّا مَتَاعٌ﴿۲۶﴾﴾ (الرعد)

﴿وَمَا ھٰذِہِ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا لَھْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ لَھِیَ الْحَیَوَانُ ۘ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ﴿۶۴﴾﴾ (العنکبوت)

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ :

((اِنَّ اللّٰہَ تَجَاوَزَ لِیْ عَنْ اُمَّتِی الْخَطَاَ وَالنِّسْیَانَ وَمَا اسْتُکْرِھُوْا عَلَیْہِ)) (۱)

(۱) سنن ابن ماجہ‘ کتاب الطلاق‘ باب طلاق المکرہ والناسی۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

’’اللہ تعالیٰ نے میری خاطر میری اُمت سے (تین قسم کے کاموں اور گناہوں کو) معاف کر دیا ہے: خطا‘ نسیان اور وہ کام جن کے کرنے پر انسان مجبور کر دیا جائے۔‘‘

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ : اَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ بِمَنْکِبَیَّ فَقَالَ :

((کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّکَ غَرِیْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ))

وَکَانَ ابْنُ عُمَرَ رضی اللہ عنہما یَقُوْلُ : اِذَا اَمْسَیْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الصَّبَاحَ ‘ وَاِذَا اَصْبَحْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الْمَسَاءَ ‘ وَخُذْ مِنْ صِحَّتِکَ لِمَرَضِکَ ‘ وَمِنْ حَیَاتِکَ لِمَوْتِکَ (۱)

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے‘ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے میرے کندھوں کو پکڑ کر فرمایا:

’’دنیا میں یوں رہو جیسے کہ اجنبی یا راہ چلتا مسافر ہو۔‘‘

ابن عمر رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے: ’’شام ہو جائے تو صبح کا انتظار نہ کیا کرو اور صبح ہو جائے تو شام کا انتظار نہ کرو۔ صحت کو بیماری سے پہلے اور زندگی کو موت سے پہلے غنیمت سمجھو۔‘‘

معزز سامعین کرام!

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہم ’’اربعین نووی‘‘ کے اختتام تک پہنچ گئے ہیں اور آج اربعین کی حدیث ۳۹ اور ۴۰ ہمارے زیر مطالعہ آئے گی۔ یہ احادیث اپنے حجم کے اعتبار سے بہت چھوٹی ہیں‘ لیکن معانی کے اعتبار سے گویا کوزے میں دریا بند ہے۔

پہلی حدیث حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے‘ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **((اِنَّ اللّٰہَ تَجَاوَزَ لِیْ عَنْ اُمَّتِی الْخَطَاَ وَالنِّسْیَانَ وَمَا اسْتُکْرِھُوْا عَلَیْہِ))** ’’اللہ تعالیٰ نے میری خاطر میری اُمت سے (تین قسم کے کاموں اور گناہوں کو) معاف کر دیا ہے: (۱) خطا‘ (۲) نسیان‘ اور (۳) وہ کام جن کے کرنے پر انہیں مجبور کر دیا گیا ہو‘‘۔ یہ حدیث حسن ہے اور اسے ابن ماجہ اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الرقاق‘ باب قول النبی ﷺ کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل۔

زیرِ مطالعہ حدیث میں پہلی غور طلب بات ہے: ((تَجَاوَزَ لِیْ عَنْ اُمَّتِی)) اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ فرما رہے ہیں کہ میری خاطر اور میرے لیے اللہ نے میری امت کے لیے یہ رعایت کی ہے۔ اسے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ حضور ﷺ کے صدقے اللہ نے اس اُمت سے یہ رعایت کی کہ ان تین چیزوں پر کوئی مواخذہ اور محاسبہ نہیں ہوگا اور نہ ہی کوئی سزا ہوگی۔

انسان اپنی صلاحیت کے مطابق مکلّف بنایا گیا ہے!

ان تین چیزوں میں سے پہلی نسیان اور دوسری خطا ہے' اور اس کے ضمن میں' میں نے جو پہلی آیت پڑھی تھی وہ سورۃ البقرۃ کی آخری آیت ہے اور اس کا شمار قرآن مجید کی بڑی عظیم آیات میں ہوتا ہے۔ اس آیت میں پہلے تو ایک بہت بڑی خوشخبری ہے اور یہ مضمون قرآن مجید میں کئی اور مقامات پر بھی آیا ہے' فرمایا: ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا﴾ ''اللہ تعالیٰ ذمہ دار نہیں ٹھہرائے گا کسی بھی جان کو' مگر اس کی وسعت کے مطابق''۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں سب کا حساب ایک جیسا اور برابر نہیں ہوگا' بلکہ ہر ایک کا حساب ہوگا اس کی صلاحیت' اس کی قدرت اور اس کی طاقت کے مطابق جو اللہ نے اسے دی ہے۔ اگر کسی کی وسعت کم ہے تو محاسبہ بھی ہلکا ہوگا اور اگر وسعت زیادہ ہے' صلاحیت زیادہ ہے' ذہانت زیادہ ہے' جسمانی قدرت زیادہ ہے تو حساب بھی اتنا ہی سخت ہوگا۔ دیکھا جائے تو یہ بہت بڑی خوشخبری ہے' اس لیے کہ دنیا کا قانون یہ نہیں دیکھتا کہ جس نے چوری کی ہے اس کی کیا مجبوری تھی اور دنیا کا قانون اس کو دیکھ بھی نہیں سکتا' لیکن اللہ کا معاملہ یہ نہیں ہے۔ ہر شخص کے اندر جو بھی وسعت ہے' اسے اللہ جانتا ہے۔ کسی شخص میں اللہ نے صرف بیس سیر بوجھ اٹھانے کی قوت رکھی تھی اور اس نے پندرہ سیر بھی اٹھا لیا تو اللہ اسے کامیاب قرار دے دے گا' لیکن جس میں من بھر کی صلاحیت رکھی تھی اُس نے بیس سیر بھی اٹھا لیا تو وہ ناکام ہو گیا۔ گویا یہاں کوئی فلیٹ ریٹ نہیں ہے۔ اسی لیے فرمایا: ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا﴾ کہ کوئی جان بھی ذمہ دار نہیں ٹھہرائی جائے گی' مکلّف نہیں ٹھہرائی جائے گی مگر اس کی وسعت کے مطابق۔

اس حوالے سے ایک شیطانی وسوسہ یہ ذہنوں میں آتا ہے کہ آدمی دین کے معاملے میں یہ کہہ کر بری ہو جاتا ہے کہ میرے اندر صلاحیت ہی نہیں ہے۔ اس صورت میں دیکھنا ہوگا کہ دنیوی معاملات میں اس شخص کی کتنی صلاحیت ظاہر ہو رہی ہے۔ اگر انسان میں صلاحیت نہیں ہے تو دنیا میں بھی کامیابی نہیں ہونی چاہیے۔ دنیا میں آپ آگے سے آگے جا رہے ہوں اور دین کے معاملے میں آپ یہ کہہ دیں کہ میرے اندر صلاحیت نہیں' تو یہ سراسر دھوکہ ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ اُس نے کس میں کتنی صلاحیت رکھی ہے اور پھر اسی کے حساب سے معاملہ ہوگا۔ بس اپنی امکانی حد تک آدمی کر گزرے' یہ کافی ہے' اس لیے کہ اللہ کو معلوم ہے کہ ہم نے کیا دیا تھا' کتنی قوت' کتنی ذہانت' کتنی صلاحیت ہم نے دی تھی۔ لیکن شیطان کے دھوکے میں نہیں آنا چاہیے اور اپنے آپ کو دین کے معاملات میں بری نہیں سمجھنا چاہیے کہ میرے پاس وسعت اور ذہانت نہیں ہے۔ اس بارے میں یہ دیکھا جائے گا اگر آپ دنیا میں کامیاب ہیں' آپ کی تجارت پروان چڑھ رہی ہے' پھل پھول رہی ہے یا آپ اپنے پیشے کے اندر دن بدن ترقی کر رہے ہیں تو ظاہر بات ہے کہ آپ میں صلاحیت موجود ہے۔ ایسی صورتِ حال میں عدم صلاحیت کا عذر رکھ کر اپنے آپ کو دین کے معاملے میں بری ٹھہرا دینا غلط ہے' نفس اور شیطان کا دھوکہ ہے۔ تاہم قاعدہ اپنی جگہ یہی ہے: ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا﴾ کہ ہر شخص اپنی وسعت کے مطابق ہی جواب دہ ہے۔

انسان کو اس کے اعمال کے مطابق بدلہ دیا جائے گا!

آگے بھی ایک اہم اصول بیان ہوا ہے' فرمایا: ﴿لَھَا مَا کَسَبَتْ وَعَلَیْھَا مَا اکْتَسَبَتْ﴾ ''ہر جان کے لیے وہی کچھ ہے جو اُس نے کمایا ہے اور اس پر وبال بھی اسی کا آئے گا جو اس نے گناہ کیے ہیں''۔ میں نے بارہا آپ کو بتایا ہے کہ لام کسی کے حق میں جانے والی بات کے لیے اور عَلٰی کسی کے خلاف جانے والی بات کے لیے آتا ہے۔ جیسے فرمانِ نبویؐ ہے: ((اَلْقُرْآنُ حُجَّۃٌ لَّکَ اَوْ عَلَیْکَ))(۱) ''قرآن یا تو حجت اور دلیل

(۱) صحیح مسلم' کتاب الطھارۃ' باب فضل الوضوء۔

ہے تمہارے حق میں یا تمہارے خلاف‘‘یعنی اس پر چلو گے‘ اس پر عمل کرو گے‘ تو وہ قیامت کے دن تمہارے حق میں گواہی دینے والا ہوگا اور اللہ سے تمہاری سفارش کرے گا‘ لیکن اگر تم اس کے خلاف چلو گے تو وہ تمہارے خلاف حجت بن جائے گا۔ یہی بات یہاں فرمائی:﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ﴾۔ یہ مضمون بھی قرآن مجید میں مختلف الفاظ کے ساتھ کئی مقامات پر بیان ہوا ہے‘ مثلاً سورۂ فاطر میں فرمایا:﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ﴾ (آیت ۱۸) ’’اور کوئی جان نہیں اٹھائے گی کسی دوسری جان کا بوجھ‘‘۔ قیامت کے روز نہ باپ بیٹے کا بوجھ اٹھا سکے گا اور نہ بیٹا باپ کا‘ نہ شوہر بیوی کا اور نہ بیوی شوہر کا۔ ہر ایک کو اپنا بوجھ خود اٹھانا ہوگا۔

قرآن مجید کی جامع ترین دعا

سورۃ البقرۃ کی آخری آیت کی ابتدا میں دو اصول بیان کرنے کے بعد‘ اب آگے ایک دعا تلقین کی گئی اور بلاشبہ یہ قرآن مجید کی جامع ترین دعاؤں میں سے ایک ہے۔ فرمایا:﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ﴾ ’’اے ہمارے رب! ہمارا مواخذہ مت کیجیو اس پر اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے خطا ہو جائے‘‘۔ خطا کسے کہتے ہیں؟ آپ نشانہ لگا رہے تھے تو وہ نشانہ صحیح جگہ پر نہیں لگا بلکہ چوک گیا تو یہ خطا ہے اور خطا سے ہونے والا کوئی کام اس اُمت کے لیے قابلِ مؤاخذہ نہیں ہے۔

قرآن مجید کی اس جامع ترین دعا کا اگلا حصہ بھی بہت اہم ہے:﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ﴾ ’’اے ہمارے رب! ہم پر مت ڈالیے وہ بوجھ جو آپ نے ہم سے پہلوں پر ڈالا تھا‘‘۔ یہاں اصل میں شریعتِ موسویؑ کی طرف اشارہ ہے جو درحقیقت بہت سخت تھی‘ جبکہ شریعتِ محمدیؐ کو بہت آسان کیا گیا ہے۔ مثلاً شریعت موسوی میں رات کو سونے پر روزہ شروع ہو جاتا ہے اور اگلے روز غروبِ آفتاب تک چلتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ہمارے لیے یہ حکم ہے کہ طلوعِ فجر سے پہلے کھاؤ پیو اور طلوعِ فجر سے روزہ شروع ہوگا جو غروب تک جائے گا۔ پھر ان کے لیے ’’یومِ سبت‘‘ کی بڑی سخت ممانعت تھی‘ یعنی جمعہ کی رات سے شروع ہو کر ہفتہ کے

غروب تک (مکمل ۲۴ گھنٹے) کوئی دنیوی کام نہیں کرنا۔ جو عملی یہودی ہیں وہ آج بھی اس پر مکمل عمل کرتے ہیں کہ ان اوقات میں بس عبادت کرو‘ تورات پڑھو اور نیکی کے کام کرو۔ وہ اپنے ٹیلی فون بھی ان اوقات میں منقطع کر دیتے ہیں اور دنیا کا کوئی کام نہیں کرتے۔ اصحابِ سبت نے اس ضمن میں ایک حیلہ کیا تھا تو ان پر بڑا سخت عذاب آیا‘ ان کی صورتیں مسخ کر دی گئیں اور وہ بندروں کی شکل کے بنا دیے گئے۔ اس کے مقابلے میں شریعت محمدیؐ میں جمعہ کے دن نمازِ جمعہ کی اذان سے لے کر نماز کے مکمل ہونے تک دنیوی کام کرنے کی پابندی ہے جو بمشکل دو گھنٹے بنتے ہیں۔ لہٰذا شریعت موسوی بہت سخت تھی تو اس کے مقابلے میں شریعت محمدیؐ میں آسانیاں پیدا کی گئیں اور اس حوالے سے رسول اللہ ﷺ نے اپنی اُمت کو بھی آسانیاں پیدا کرنے کی تعلیم فرمائی ہے: ((يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا))(۱) ’’لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کرو اور سختی نہ کیا کرو۔‘‘

عام طور پر ہمارے ہاں بعض علماء کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ آپ کو تو سخت سے سخت بات کا فتویٰ دیں گے اور خود انہیں ’’کتابُ الحیل‘‘ کی رو سے معلوم ہے کہ کس حیلے کے ذریعے بچا جا سکتا ہے اور وہ خود ان حیلوں پر عمل کرتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ آپ اپنے لیے زیادہ سے زیادہ سختی کریں اور دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کریں۔ شریعت کے اندر جو بھی گنجائش نکل سکتی ہے‘ وہ لوگوں کو نکال کر دکھائیں۔ بخوائے قرآنی:﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (البقرۃ:۱۸۵) ’’اللہ تو تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے‘ اور وہ تمہارے ساتھ سختی نہیں چاہتا۔‘‘

سورۃ البقرۃ کی زیرِ مطالعہ آیت ﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ﴾ میں دو لفظ قابلِ غور ہیں: اِصر اور حَمل۔ ’’اصر‘‘ کہتے ہیں اصل میں اس بوجھ کو جس کو اٹھا کر چلنا دوبھر ہو جائے اور ’’حمل‘‘ کہتے ہیں اُس بوجھ کو جس کو لے کر چلا جا سکے۔ چنانچہ بوجھ اٹھا کر چلنے والے پلے دار کو ’’حمّال‘‘ کہا جاتا

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الادب‘ باب قول النبی ﷺ یسروا ولا تعسروا۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الجهاد والسیر‘ باب فی الامر بالتیسیر وترك التنفیر۔

ہے۔ حضورﷺ کی شان میں سورۃ الاعراف میں یہ آیت آئی ہے: ﴿وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ﴾ (آیت ۱۵۷) ''اور (نبی اکرمﷺ) ان سے اتار دیں گے ان کے بوجھ اور طوق جوان (کی گردنوں) پر پڑے ہوں گے''۔ یہود کا معاملہ یہ تھا کہ ایک تو اصلاً شریعت سخت تھی اور پھر یہودی علماء نے بھی لوگوں کے لیے سختی در سختی کے قانون کے اپنایا تو لوگوں پر وہ بوجھ ناقابلِ برداشت ہوگیا۔ شریعتِ محمدیؐ نے وہ بوجھ اتار دیا اور لوگوں کے لیے نرمی پیدا کر دی۔ چنانچہ اُمتِ محمدیؐ کو اس دعا کی تلقین کی گئی: ﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِنَا ۚ﴾

''اے ہمارے رب! ہم پر مت ڈالیے وہ بوجھ جو آپ نے ہم سے پہلوں پر ڈالا تھا۔''

آگے پھر وہی بات دوبارہ فرمائی: ﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ ۖ﴾ ''اے ہمارے رب! ہم پر ایسا بوجھ بھی نہ ڈالیو جس کی ہمارے اندر طاقت نہ ہو''۔ ﴿وَاعْفُ عَنَّا ۗ وَاغْفِرْ لَنَا ۗ﴾ ''اور ہمیں معاف کرتا رہ اور ہمارے گناہوں کی پردہ پوشی فرما''۔ ﴿وَارْحَمْنَا ۚ أَنتَ مَوْلَانَا﴾ ''اور تو ہم پر رحم فرما' تو ہی ہمارا مولا ہے''۔ ﴿فَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿٢٨٦﴾﴾ ''اور ہماری مدد کر کافروں کے مقابلے میں''۔ اس میں اشارہ ہوگیا کہ کفر کے خلاف جدوجہد اہلِ ایمان پر فرض ہے اور جو نہیں کرتے وہ فرض کے تارک ہوں گے۔ اور اگر وہ جِدّوجُہد کر رہے ہیں تو پھر اللہ کی مدد بھی آئے گی۔

جبر واکراہ کی معافی

زیرِ مطالعہ حدیث میں تین چیزوں کا تذکرہ تھا کہ جن پر اللہ کی طرف سے اس اُمت کے لیے معافی کا اعلان ہے: (۱) خطا' (۲) نسیان' اور (۳) وہ کام جن کے کرنے پر کسی شخص کو مجبور کر دیا گیا ہو۔ سورۃ البقرۃ کی بیان کردہ آیت میں پہلی دو باتوں کی وضاحت ہوگئی۔ تیسری چیز جبر اور اکراہ ہے' یعنی وہ کام جس کے کرنے پر کسی کو بے انتہا مجبور کر دیا جائے اور اس کے پاس اُس کام کو کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہ رہے۔ ایسی صورت میں کیا جانے والا فعل قابلِ مؤاخذہ نہیں ہے۔ یہ جبر دو طرح کا ہو سکتا ہے' ایک جبر خارجی ہے اور ایک جبر داخلی ہے۔ خارجی جبر تو یہ ہے کہ کوئی شخص آپ کو

قتل کرنے پر تلا ہوا ہے کہ کفر کرو ورنہ میں تمہیں قتل کرتا ہوں۔ ایسی صورت میں جان بچانے کے لیے کلمۂ کفر کہہ دیا جائے تو اس کی اجازت ہے۔

اس حوالے سے ایک اہم واقعہ تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے۔ مکہ مکرمہ میں تین افراد پر مشتمل ایک خاندان تھا: حضرت سُمیہؓ' حضرت یاسر اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم۔ عمار بیٹے ہیں اور سمیہ اور یاسر ماں باپ ہیں۔ ان کا قصہ اصل میں یہ ہے کہ یاسر یمن کے رہنے والے تھے اور انہیں خواب میں بشارت ہوئی کہ مکہ کی سرزمین میں نبی آخر الزماںﷺ کا ظہور ہونے والا ہے' تو وہ وہاں سے مکہ آگئے۔ مکہ کا دستور یہ تھا کہ وہاں یا تو قریشی رہ سکتا تھا یا قریشی کا غلام یا قریشی کا حلیف۔ کوئی شخص اگر مکہ سے باہر سے آ کر وہاں رہائش پذیر ہونا چاہتا تو اُس کے پاس دو اختیار تھے کہ یا تو کسی قریشی کی غلامی میں آئے یا پھر کسی قریشی سردار کا حلیف بن کر اس کے تحفظ (protection) میں آجائے۔

مثال دے رہا ہوں' جیسے آج کل آپ سعودی عرب میں کوئی کاروبار کرنا چاہیں تو اس کاروبار کی شرط یہ ہے کہ ایک سعودی باشندہ لازماً ''کفیل'' ہوگا اور اس کے ساتھ مل کر آپ کام کریں گے۔ اس کا فائدہ وہاں کے باشندوں کو یہ ہوتا ہے کہ باہر سے آنے والا' مثلاً کوئی ہندوستانی یا پاکستانی سعودی عرب میں کاروبار کرتا ہے' دن رات محنت مزدوری کرتا ہے' لیکن اس کی کمائی میں سے ملائی وہ سعودی باشندہ لے جاتا ہے۔ ہے تو یہ بالکل ناانصافی' لیکن بہرحال یہ سعودی عرب کا قانون ہے۔ اسی طرح دورِ جاہلیت میں بھی قاعدہ تھا کہ مکہ کے باہر سے آنے والا کسی قریشی کا غلام بن کر رہے یا حلیف بن کر۔ چنانچہ یاسر یمن سے مکہ آئے اور یہاں آ کر ابوجہل کے ایک چچا' جو نیک آدمی تھا' کی کفالت اور حمایت میں اس کے حلیف بن کر مکہ میں رہنے لگے۔ اسی کی ایک لونڈی سمیہ تھی تو اُس کی اجازت سے یاسر نے سمیہ سے شادی کر لی اور اللہ نے انہیں عمار بیٹا دیا۔ نبی اکرمﷺ کے اعلانِ نبوت کے بعد یہ گھرانہ حلقہ بگوشِ اسلام ہوگیا۔

ابوجہل کا وہ چچا جب فوت ہوگیا تو وراثتاً یہ سارا خاندان ابوجہل کو منتقل ہوگیا جو اسلام کا بدترین دشمن تھا۔ ابوجہل نے پھر ان پر ظلم وستم کے جو پہاڑ توڑے اور جس حد

تک تشدد کیا' اس کا تذکرہ کرتے اور سنتے وقت انسان پر جھرجھری طاری ہو جاتی ہے۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ نوجوان تھے' ان کو ایک درخت کے تنے کے ساتھ باندھ دیا گیا اور ان کی نگاہوں کے سامنے ان کی ماں کو برہنہ کر کے جگہ جگہ کچوکے لگائے گئے کہ باز آ جاؤ اور اسلام سے بیزاری کا اعلان کر دو! یہاں تک کہ ابوجہل کے ہاتھ میں ایک بت تھا' ابوجہل نے کہا کہ ایک دفعہ کہہ دو کہ ہاں یہ بھی کوئی معبود ہے اور اس میں بھی کوئی حقیقت ہے' لیکن حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا نے اس پر تھوک دیا۔ اس بدبخت نے غصے میں آ کر حضرت سمیہ کی شرم گاہ پر برچھا مارا اور انہیں شہید کر دیا (حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو اسلام کی پہلی شہید خاتون ہونے کا شرف حاصل ہوا)۔ اسی طرح کا معاملہ حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی ہوا اور ان کو بھی بہت اذیت ناک طریقے سے شہید کیا گیا۔ ابوجہل نے چار طاقتور اونٹ لیے اور ان میں سے ایک کے ساتھ حضرت یاسر کا ایک ہاتھ' دوسرے کے ساتھ دوسرا ہاتھ' تیسرے کے ساتھ ایک ٹانگ اور چوتھے کے ساتھ دوسری ٹانگ باندھ دی اور پھر چاروں اونٹوں کو مختلف سمتوں میں اس طرح دوڑایا کہ حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کے جسم کے پرخچے اُڑ گئے۔

دین میں عزیمت بھی ہے اور رخصت بھی

حضرت یاسر اور سمیہ رضی اللہ عنہما تو اتنے بدترین جبر کی حالت میں بھی ثابت قدم رہے اور موت کو سینے سے لگا لیا' لیکن کلمۂ کفر نہیں کہا۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ نوجوان تھے' وہ اس صورتِ حال کو برداشت نہیں کر سکے اور کلمۂ کفر کہہ کے جان بچا لی۔ اب اُن پر پشیمانی طاری ہوئی کہ یہ میں کیا کر بیٹھا ہوں۔ اس پر انہوں نے اپنے آپ کو ایک ستون سے باندھ دیا اور کہا کہ اب تو محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی آ کر مجھے یہاں سے کھولیں گے' ورنہ میں یہیں پر جان دے دوں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کا علم ہوا تو آپؐ آئے اور اپنے دستِ مبارک سے ان کو کھولا اور فرمایا کہ اونچا ترین مقام تو تمہارے ماں باپ لے گئے اور جو تم نے کیا تو اس کی بھی اجازت ہے۔ چنانچہ جس پر اس درجے جبر کیا گیا ہو تو وہ کلمہ کفر کہہ کر اپنی جان بچا سکتا ہے' یہ جائز ہے اور اس کی رخصت ہے۔ چنانچہ دین میں رخصت بھی ہے

اور عزیمت بھی۔ عزیمت والے تو روشن چراغ بن جاتے ہیں اور لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں اور ان کے تذکرے سے دلوں کے اندر ایمانی جذبات اُبھرتے ہیں۔ دوسری طرف رخصت والے اگرچہ اُس اونچے مقام کو حاصل نہیں کر پاتے جو عزیمت والوں کے حصہ میں آتا ہے' لیکن ان پر بھی کوئی الزام نہیں ہے' اس لیے کہ اسلام میں اس کی اجازت ہے۔

اس حوالے سے سورۃ النحل کی یہ آیت بھی میں نے آپ کو ابتدا میں سنائی تھی: ﴿مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ﴾ ''جس کسی نے کفر کیا اللہ کے ساتھ ایمان لانے کے بعد' سوائے اُس کے جسے مجبور کر دیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان پر برقرار ہو'' ﴿وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۱۰۶﴾ ''مگر جس نے کھول دیا کفر کے ساتھ (اپنا) سینہ تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہے' اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے''۔ اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ کسی کو اتنا مجبور کر دیا گیا ہو کہ اُس نے جان بچانے کے لیے کلمہ کفر کہہ دیا ہو تو اس کی اجازت ہے اور اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا' لیکن شرط یہ ہے کہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو۔

اضطراری حالت میں بھی رخصت ہے!

اب تک خارجی جبر کی بات ہوئی کہ ابوجہل ستا رہا تھا' اذیت دے رہا تھا' جان کے درپے تھا تو جان بچانے کے لیے کلمہ کفر کہہ دیا۔ اسی طرح ایک داخلی جبر بھی ہے' وہ یہ کہ انسان بھوک سے مر رہا ہے' لیکن اس کے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ اس حالت کو اضطرار کہتے ہیں اور اضطراری حالت میں اگر انسان کوئی حرام چیز بھی کھا لے تو اس کی اجازت ہے' لیکن اس کے لیے دو شرائط ہیں۔ قرآن مجید میں یہ مضمون پانچ مرتبہ آیا ہے۔ فرمایا: ﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾ (البقرۃ:۱۷۳) ''پھر جو کوئی مجبور ہو جائے اور وہ خواہش مند اور حد سے آگے بڑھنے والا نہ ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں''۔ اس سے پہلے فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر یہ چیزیں حرام کر دی ہیں' مردار'

خون‘ خنزیر کا گوشت اور جس پر اللہ کے سوا کسی کا نام پکارا گیا ہو۔ پھر فرمایا کہ اگر کوئی اضطرار میں آ گیا ہو‘ مجبوری میں مر رہا ہو تو پھر وہ سور بھی کھا سکتا ہے‘ مردار بھی کھا سکتا ہے اور غیر اللہ کے نام پر ذبح ہونے والے جانور کا گوشت کھا کر بھی اپنی جان بچا سکتا ہے۔لیکن اس کے لیے دو شرطیں عائد کی گئی ہیں‘ ایک تو وہ اس حرام کی طرف رغبت اور میلان نہ رکھتا ہو اور دوسرے یہ کہ جان بچانے کے لیے جو ناگزیر مقدار ہے اس سے آگے نہ بڑھے۔ان دو شرطوں کے ساتھ حالت اضطرار میں جان بچانے کے لیے حرام چیز بھی کھائی جا سکتی ہے۔لہٰذا ہمارے ہاں فقہ کے اصولوں میں سے ایک اصول ہے: ’’الضرورات تبیح المحظورات‘‘ یعنی جہاں مجبوریاں ہوگئی ہوں وہاں ممنوع چیزوں کی بھی اجازت ہوتی ہے۔لیکن وہ اضطرار کی حالت میں ہے۔ یہ نہیں کہ ذرا سی آسانی دیکھ لی یا ذرا سی مشکل آئی تو حرام میں منہ مار لیا۔دل میں ایک خیال آیا کہ ہم اس وقت تک اپنا کاروبار وسیع نہیں کر سکتے جب تک سود کو کاروبار میں شامل نہ کریں.....تو اس کی کسی صورت اجازت نہیں ہے۔البتہ بھوک سے مر رہے ہوں اور کوئی ذریعہ نہ ہو تو اس صورت میں جان بچانے کے لیے حرام شے بھی حلال ہو جائے گی۔

دنیا کی بے ثباتی

اب اگلی حدیث کی طرف آتے ہیں۔ یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے‘ جبکہ پہلی روایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی تھی‘ جن کے بارے میں حضور ﷺ نے یہ دعا کی تھی: ((اَللّٰھُمَّ فَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ وَعَلِّمْہُ التَّاوِیْلَ))(۱) ’’اے اللہ! اس نوجوان کو دین کا فہم اور قرآن کی تاویل سکھا دے‘‘۔تفسیر میں ایک ایک لفظ کے لغوی و معنوی مفاہیم کے حوالے سے بات ہوتی ہے‘ جبکہ بحیثیت مجموعی اس آیت کا مدعا بیان کر دینا یہ تاویل ہے — صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے چار ’’عبادلہ‘‘ مشہور ہیں اور چاروں نوجوان ہیں۔عبداللہ بن عمر‘ عبداللہ بن زبیر‘ عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم۔زیر مطالعہ روایت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے

(۱) مسند احمد‘ کتاب و من مسند بنی ھاشم‘ باب بدایۃ مسند عبداللّٰہ بن العباس۔

بیٹے عبداللہؓ سے مروی ہے۔حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما میں حضور ﷺ کے اتباع کا بہت زیادہ جذبہ تھا۔چنانچہ جو لوگ حدیث کا زیادہ ذوق رکھتے ہیں‘ ان کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ زیادہ ذہنی مناسبت ہوتی ہے۔اس ذوقِ حدیث کے حوالے سے یہ بڑی پیاری حدیث ہے۔وہ فرماتے ہیں: اَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ بِمَنْکِبَیَّ فَقَالَ: ’’اللہ کے رسول ﷺ نے مجھے میرے دونوں کندھوں سے پکڑا اور پھر فرمایا:

((کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّکَ غَرِیْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ))

’’دنیا میں ایسے رہو گویا تم اجنبی ہو یا راہ چلتے مسافر!‘‘

دنیا سے تمہارا تعلق بس اسی قدر رہنا چاہیے۔اس سے زیادہ اگر دنیا کے ساتھ دل لگا لیا تو تباہی اور بربادی ہے‘ اس لیے کہ یہ دنیا تو راہ گزر ہے‘ منزل نہیں ہے اور راہ گزر میں آدمی تھوڑی دیر آرام کے لیے کہیں بیٹھ سکتا ہے‘ لیکن وہاں مستقل ڈیرے نہیں لگا لیتا۔ چنانچہ حضور ﷺ نے خود اپنے بارے میں یہ مثال دی: ((مَا لِی وَمَا لِلدُّنْیَا)) ’’دیکھو لوگو! میرا دنیا سے کیا سروکار‘‘۔آپ ﷺ نے تو دنیا سے کوئی سروکار رکھا ہی نہیں۔ جب آپؐ عرب کے بادشاہ بن گئے تب بھی آپؐ کے ہاں تو کئی کئی وقت کا فاقہ ہوتا تھا۔ ((مَا أَنَا فِی الدُّنْیَا إِلَّا کَرَاکِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَۃٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَکَھَا))(۱) ’’میں تو دنیا میں اس طرح ہوں کہ جیسے کوئی سوار کسی درخت کے نیچے سائے کی وجہ سے بیٹھ گیا‘ پھر وہاں سے روانہ ہو گیا اور درخت کو چھوڑ دیا‘‘۔ درخت اس کی منزل نہیں ہے‘ اس کا گھر نہیں ہے۔ یہ تو اس کا عارضی سا قیام تھا جسے وہ یاد بھی نہیں رکھتا کہ میری زندگی کے اندر کوئی درخت بھی آیا تھا۔بس صرف اس حد تک دنیا کے اندر دلچسپی کی اجازت ہے‘ اور اگر اس سے زیادہ ہے تو پھر یہ دھوکہ ہے۔

یہ دنیا‘ متاعِ غرور‘ متاعِ قلیل اور لہو و لعب ہے

قرآن مجید میں دنیوی زندگی کی بے ثباتی کو بیان کرنے کے لیے اسے مختلف القابات سے نوازا گیا ہے‘ مثلاً بعض مقامات پر اسے ’’متاع الغرور‘‘ (دھوکے کا سامان) کہا گیا

(۱) سنن الترمذی‘ ابواب الزھد‘ باب ما جاء فی اخذ المال بحقہ۔

ہے:﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ (آل عمران:۱۸۵ و الحدید:۲۰) ''اور یہ دنیا کی زندگی تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ صرف دھوکے کا سامان ہے''۔ علامہ اقبال کی ایک بڑی پیاری نظم ہے' جس کا پہلا مصرع ہے: ''خودی کا سرِنہاں لا الٰہ الا اللہ'' اور اس میں یہ مصرع بھی ہے ع ''کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا!'' —— دیکھو تم اس متاعِ غرور یعنی دھوکے کے سامان کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے ہو جو تمہیں آخرت سے غافل کر رہا ہے۔ ہاں دنیا اگر اس حیثیت میں ہو کہ آخرت سے غافل نہ کر پائے تو دنیا میں کوئی برائی نہیں ہے۔ اس ضمن میں ایک حدیث بھی بیان کی جاتی ہے: ((اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْآخِرَةِ))(۱) ''دنیا آخرت کی کھیتی ہے''۔ یہاں بوؤ گے تو وہاں کاٹو گے نا! اسلام میں ترکِ دنیا اور رہبانیت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ جو لوگ ترکِ دنیا کر کے بیٹھ گئے' وہ تو یہاں کچھ کاشت ہی نہیں کر رہے تو وہ وہاں کون سی فصل کاٹیں گے؟ لہٰذا دنیا کو چھوڑنا نہیں ہے بلکہ دنیا میں رہتے ہوئے یہاں اللہ کے دین کو غالب کرنا ہے۔

اسی طرح سورۃ النساء میں دنیا کو ''متاعِ قلیل'' قرار دیا گیا ہے:﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ﴾ (آیت ۷۷) ''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے دنیا کا ساز و سامان بہت تھوڑا ہے' اور آخرت بہت بہتر ہے اس کے لیے جو تقویٰ کی روش اختیار کرے''۔ یہی مضمون سورۃ الرعد میں بایں الفاظ بیان ہوا:﴿وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ﴾ ''اور یہ لوگ مگن ہیں دنیا کی زندگی پر' حالانکہ دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے سوائے تھوڑے سے فائدے کے۔''

میرے نزدیک سورۃ العنکبوت کی آیت اس معاملے میں سب سے اوپر ہے جس میں اس دنیا کی زندگی کو لہو و لعب قرار دیا گیا ہے' فرمایا:﴿وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ﴾ ''اور نہیں ہے یہ دنیا کی زندگی مگر لہو اور لعب''۔ لعب کہتے ہیں کھیل کود کو اور لہو کے اندر کچھ نہ کچھ تلذّذ کی کیفیت (sensual gratification) بھی آ جاتی ہے۔

(۱) تخریج الاحیاء للعراقی ۲۴/۴۔ وقال: لم اجده لهذا اللفظ مرفوعا۔

ایک بچہ کھیل رہا ہے اور اس کے کھیل کے اندر اس کی نفسانیت اور شہوت کا کوئی دخل نہیں ہے تو یہ لعب ہے' لیکن جب اس میں شہوانیت کا حصہ بھی شامل ہو جائے تو وہ لہو بن جاتا ہے۔ چنانچہ یہ دنیا کی زندگی سوائے لہو اور لعب کے اور کچھ نہیں ہے۔﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾ ''اور آخرت کا گھر ہی یقیناً اصل زندگی ہے۔ کاش کہ انہیں معلوم ہوتا!''

سورۃ الاعلیٰ میں فرمایا:﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى﴾ ''بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو' جبکہ آخرت بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والی بھی'' —— ایثار کہتے ہیں کسی چیز کو دوسری پر ترجیح دینا۔ ہم اردو میں بولتے ہیں ایثار کرو' یعنی اپنے مفاد پر دوسروں کے مفاد کو مقدم رکھو۔ ایک شخص مذہبی کام بھی کر رہا ہے' نماز روزہ کا بھی پابند ہے' تو اصل جانچنے کی چیز یہ ہے کہ کیا اس کی زندگی یہ ثبوت دے رہی ہے کہ وہ آخرت کو ترجیح دے رہا ہے یا دنیا کو؟ دیکھنا ہوگا کہ وہ اپنی بہتر سے بہتر صلاحیت دنیا کے لیے استعمال کر رہا ہے یا آخرت کے لیے؟ اگر اس کی زیادہ توجہ آخرت کے حق میں ہے تو تہنیت ہے' مبارک باد ہے اور اگر دنیا کے لیے ہے تو معاملہ تشویش ناک ہے۔

بعض بزرگوں نے انسان اور دنیا کی مثال اس طرح دی ہے کہ دنیا اور انسان کا معاملہ ایک کشتی کا سا ہے۔ کشتی پانی کے اوپر چل رہی ہے تو معاملہ درست ہے' لیکن اگر پانی کشتی میں آ گیا تو تباہی و بربادی ہے۔ اسی طرح تم دنیا میں تو رہو' لیکن تمہارے دل میں دنیا نہیں آنی چاہیے۔ دنیا میں ایسے رہو کہ ع ''بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں!''

''اسلام اجنبی تھا اور عنقریب اجنبی ہو جائے گا!''

زیر مطالعہ اربعین کی حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((كُنْ فِي الدُّنْيَا كَاَنَّكَ غَرِيْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ))۔ اب یہ غریب کا لفظ بھی بڑا عجیب ہے۔ غریب کہتے ہیں اجنبی کو —— ایک شخص عین مجمع کے اندر رہتے ہوئے بھی غریب ہو سکتا ہے' اسے کوئی پہچانتا ہی نہ ہو اور نہ وہ کسی کو جانتا ہو' تو اسے کہیں گے کہ مجمع میں غریب ہے۔ ایسا بھی ہوتا

ہے کہ ایک بندۂ مؤمن کسی ایسے ماحول میں رہ رہا ہوتا ہے کہ اُس کے دل کو جو لگن لگی ہوئی ہے‘ وہ کسی اور کے دل میں نہیں ہے۔ سب دنیا کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور اسے آخرت کی فکر ہے تو یہ بھی اس ماحول میں اجنبی ہو جائے گا۔

لفظ غریب کے حوالے سے ایک بڑی عظیم حدیث ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((بَدَأَ الْاِسْلَامُ غَرِیْبًا وَسَیَعُوْدُ کَمَا بَدَاَ‘ فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَاءِ))(۱) ’’اسلام اپنے آغاز میں اجنبی تھا اور عنقریب وہ اجنبی ہو جائے گا جیسا کہ ابتدا میں تھا‘ پس خوشخبری ہے اجنبیوں کے لیے‘‘۔ اسلام کا جب آغاز ہوا تو اسلام اجنبی تھا‘ غریب تھا۔ کوئی اسلام لے آتا تھا تو کفارِ مکہ کہتے تھے کہ اس کی مت ماری گئی ہے۔ مدینہ کے منافق بھی ایمان لانے والوں کو بیوقوف کہا کرتے تھے: ﴿وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ اٰمِنُوْا کَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ﴾ ’’اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ‘ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں‘‘۔ جیسے ابوبکر‘ عمر‘ عثمان اور علی ایمان لائے ہیں‘ حمزہ‘ طلحہ اور زبیر ایمان لائے ہیں (رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ) تو تم بھی انہی کے نقش قدم پر چلو۔ اس کے جواب میں وہ کہتے تھے: ﴿اَنُؤْمِنُ کَمَآ اٰمَنَ السُّفَھَآءُ﴾ ’’کیا ہم اس طور سے ایمان لے آئیں جیسے ان بیوقوفوں نے اسلام قبول کیا ہے؟‘‘ یہ تو بیوقوف ہیں کہ ایمان لانے کے بعد انہیں کسی چیز کی فکر ہی نہیں ہے۔ نہ دائیں کی فکر‘ نہ بائیں کی‘ بس ان کا مقصد تو اللہ‘ اللہ کے رسول ﷺ اور ان کے احکامات کو ماننا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا ہے۔ یہ بات آج بھی کہی جاتی ہے کہ یہ لوگ دین کے کام میں لگ گئے ہیں۔ یہ سوچتے ہی نہیں کہ ہماری بیٹیاں بھی گھروں میں بیٹھی ہوئی ہیں جن کے ہاتھ پیلے کرنے ہیں تو اس کے لیے کچھ پیسے جمع کریں۔ لہٰذا یہ تو بیوقوف (سُفَھَا) ہیں۔ یہ تو fanatics ہیں‘ شدت پسند ہیں‘ انتہا پسند ہیں۔ یہ سارے الفاظ اصل میں اسی لفظ (سُفَھَاء) کی شرح ہے۔

چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا: ((بَدَأَ الْاِسْلَامُ غَرِیْبًا وَسَیَعُوْدُ کَمَا بَدَاَ)) ’’اسلام اپنے آغاز میں اجنبی تھا اور عنقریب وہ اجنبی ہو جائے گا جیسا کہ آغاز میں تھا‘‘۔ یہ ایک

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب بیان ان الاسلام غریبا و سیعود غریبا.....

بہت بڑی حقیقت ہے جس کی طرف رسول اللہ ﷺ نے اشارہ کیا ہے۔ یہ کب ہوگا اس بارے میں سمجھ لیجیے۔ لفظ ’’سَ‘‘ عربی میں مستقبل قریب کے لیے آتا ہے اور مستقل بعید کے لیے ’’سَوْفَ‘‘ آتا ہے۔ جیسے قرآن مجید میں کئی مقامات پر آیا ہے: ﴿سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ﴾ کہ ابھی تو تمہاری آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں‘ لیکن ایک وقت آئے گا کہ تمہاری آنکھوں سے پردے اُٹھ جائیں گے اور حقیقت تمہارے سامنے منکشف ہو جائے گی۔ اُس وقت کے آنے میں ابھی کچھ وقت باقی ہے اور تمہارے پاس کچھ مہلت موجود ہے۔ لیکن سین (سَ) مستقبل قریب کے لیے آتا ہے اور آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَسَیَعُوْدُ کَمَا بَدَاَ)) کہ عنقریب اسلام دوبارہ اجنبی ہو جائے گا ایسے ہی جیسے کہ پہلے تھا۔ یہ بڑی عظیم تاریخی حقیقت ہے۔ خلافت راشدہ کے خاتمے کے بعد اسلام زوال پذیر ہوا اور آج تک زوال پذیر ہے۔ اگرچہ عربوں کو بڑی عظمت حاصل ہوئی کہ پہلے بنوامیہ کی سلطنت قائم ہوئی اور پھر بنوعباس کی عظیم سلطنت‘ جو اُس وقت دنیا میں سب سے بڑی سلطنت تھی‘ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں اسلام غریب تھا۔ اس وقت جس کی لاٹھی‘ اس کی بھینس اور جس کی طاقت‘ اس کی حکومت کا معاملہ تھا۔ جبکہ اسلام کے اصول ﴿اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ﴾ کا معاملہ بالکل ختم ہو گیا تھا۔

فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَاءِ

اس حدیث کے آخر میں رسول اللہ ﷺ نے دین کے اجنبیت کے دور میں دین سے چمٹے رہنے والوں کو مبارک باد بھی دی ہے: ((فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَاءِ)) ’’تو مبارک باد اور تہنیت ہے ان کے لیے جو خود غریب ہو جائیں‘‘۔ یعنی جب اسلام غریب ہو جائے تو آپ اس کے دامن کے ساتھ چمٹے رہیں۔ چاہے دنیا کہے کہ ع ’’اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو!‘‘ ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ اس دور میں پردے کی بات کرتے ہیں‘ ان کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اس اعتبار سے اگر لوگ آپ سے نفرت بھی رکھیں تو اس کی پروا نہ کریں۔ جب میں نے پردے کی بات کی تو مجھے یہ خطاب ملا تھا:

The most hated person in the educated ladies of Pakistan.

پاکستان کی پڑھی لکھی خواتین میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت شخصیت!

یہ پردے کی بات کرتا ہے‘ یہ segregation کی بات کرتا ہے‘ یہ ستر کی بات کرتا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں آپ بالکل اجنبی ہو جائیں‘ اس لیے کہ ہمیں اجنبی رہنے کے اندر ہی عافیت نظر آتی ہے اور ہم کسی صورت زمانے کا ساتھ نہیں دیں گے۔ اب ایسی صورتِ حال میں کسی بھی معاشرے کے اندر زندگی گزارنے کے دو انداز ہیں۔ ایک یہ کہ ع ’’زمانہ با تو نسازد‘ تو با زمانہ بساز!‘‘ یعنی اگر زمانہ تمہارے ساتھ ہم آہنگی اختیار نہیں کرتا تو تم زمانے کے رنگ میں رنگے جاؤ۔ گویا ع ’’چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی!‘‘ اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ ’’زمانہ با تو نسازد‘ تو با زمانہ ستیز!‘‘ کہ اگر زمانہ تمہارے ساتھ ہم آہنگی نہیں کر رہا تو تم زمانے کے ساتھ لڑو‘ زمانے کے خلاف جنگ کرو!

پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو!

زیر مطالعہ حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو کندھے سے پکڑ کر انہیں فرمایا: ((كُنْ فِي الدُّنْيَا كَاَنَّكَ غَرِيْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ))۔ اس سے آگے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے جو وہ رسول اللہ ﷺ کی اس نصیحت پر عمل کرتے ہوئے کہا کرتے تھے۔ اسے بھی ہم حدیث ہی کہیں گے — رسول اللہ ﷺ کا قول‘ فعل‘ اور آپ کی تقریر کو اصطلاحِ حدیث میں خبر (جمع اخبار) کہا جاتا ہے‘ جبکہ کسی صحابی کے قول‘ عمل‘ اور تقریر کو اثر (جمع آثار) کہا جاتا ہے۔ اگر خبر اور اثر کسی ایک جگہ جمع ہو جائیں تو وہ اثر بھی حدیث بن جائے گا — حضرت ابن عمرؓ فرمایا کرتے تھے: اِذَا اَمْسَيْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الصَّبَاحَ ’’دیکھو جب تمہیں شام ہو جائے تو صبح کا انتظار مت کرنا‘‘۔ یہ نہ سمجھنا کہ صبح بھی لازماً ہو گی‘ کیا پتا رات کو ہی بلاوا آ جائے۔ وَاِذَا اَصْبَحْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الْمَسَاءَ ’’اور اگر صبح نصیب ہو جائے تو شام کا انتظار مت کرو‘‘۔ یہ نہ سمجھنا کہ شام ضرور اسی دنیا کی زندگی میں آئے گی۔ اس درجے انسان دنیا سے ذہناً اور قلباً لاتعلق ہو جائے۔ وَخُذْ مِنْ صِحَّتِكَ لِمَرَضِكَ ’’اور اپنی صحت (جو اللہ نے دی ہے) میں سے اپنے مرض کے لیے کچھ بچا کر رکھ لو‘‘۔ مریض بن جاؤ گے تو پھر کچھ نہیں کر سکو

گے‘ لہٰذا اللہ نے صحت دے رکھی ہے تو اسے غنیمت سمجھو اور آخرت کی کچھ تیاری کر لو۔ وَمِنْ حَيَاتِكَ لِمَوْتِكَ ’’اور اپنی زندگی سے موت کے لیے ساز و سامان پیدا کر لو۔‘‘

اس مضمون کی حدیث اس سے پہلے بھی ہمارے بیان میں آ چکی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ: شَبَابَكَ قَبْلَ هَرَمِكَ، وَصِحَّتَكَ قَبْلَ سَقَمِكَ، وَغِنَاكَ قَبْلَ فَقْرِكَ، وَفَرَاغَكَ قَبْلَ شُغْلِكَ، وَحَيَاتِكَ قَبْلَ مَوْتِكَ))(۱)

’’پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو: (۱) جوانی کو بڑھاپے سے پہلے‘ (۲) صحت کو بیماری سے پہلے‘ (۳) مالداری کو تنگ دستی سے پہلے‘ (۴) فراغت کو مشغولیت سے پہلے‘ اور (۵) زندگی کو موت سے پہلے۔‘‘

آج جو دو احادیث ہمارے زیر مطالعہ تھیں‘ ان میں دین کے عملی نظام کے دو پہلو ہمارے سامنے آ گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دین کا فہم‘ یقین قلبی والا ایمان‘ اور بحیثیت مؤمن جو ہمارے فرائض ہیں‘ ان کو ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

اَقُوْلُ قَوْلِيْ هٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِيْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ۝۝

(مرتب: حافظ محمد زاہد‘ ادارتی معاون‘ شعبہ مطبوعات)

(۱) رواہ البیہقی فی شعب الایمان‘ راوی: عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما۔

شرک کی حقیقت، اقسام اور دورِ حاضر
کے شرک سے واقفیت کے لیے مطالعہ کیجیے

حقیقت و اقسامِ شرک

ڈاکٹر اسرار احمد

اشاعت خاص 100 روپے، اشاعت عام 60 روپے

قرآنِ کریم کی اُصولی باتیں (۷)

پروفیسر ڈاکٹر عمر بن عبداللہ المقبل

ترجمہ: ابوعبدالرحمٰن شبیر بن نور

اٹھارھواں اصول:

﴿وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ؕ﴾

''اور بُری تدبیروں کا وبال اُن تدبیر والوں پر ہی پڑتا ہے۔''

قرآن کریم کا یہ مضبوط قاعدہ اس لیے بیان ہوا ہے تاکہ مخلوقات کے باہمی معاملات کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کی سنت اور طریقے کو واضح کیا جا سکے۔ سورۂ فاطر کی آیات کے پس منظر میں یہ قرآنی قاعدہ بیان ہوا ہے۔ اِن آیات کا ذکر کرنا اس لیے بہتر ہے کہ اس کا معنیٰ واضح ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ ہٹ دھرموں کے ایک گروہ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرَا ﴿۴۲﴾ ۨ اسْتِكْبَارًا فِى الْاَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ؕ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ؕ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ﴿۴۳﴾﴾ (فاطر)

''اور ان کفار نے بڑی زوردار قسم کھائی تھی کہ اگر ان کے پاس کوئی خبردار کرنے والا آیا تو وہ ہر ایک اُمت سے زیادہ ہدایت قبول کرنے والے ہوں گے۔ پھر جب اِن کے پاس ایک پیغمبر آ پہنچے تو بس ان کی نفرت میں ہی اضافہ ہوا۔ دنیا میں اپنے کو بڑا سمجھنے کی وجہ سے اور ان کی بُری تدبیروں کی وجہ سے۔ اور بُری تدبیروں کا وبال تو ان تدبیر والوں پر ہی پڑتا ہے۔ سو کیا یہ اسی دستور کے منتظر ہیں جو اگلے لوگوں کے ساتھ ہوتا رہا ہے؟ سو آپ اللہ کے دستور کو کبھی بدلتا ہوا نہ پائیں گے‘ اور اللہ کے دستور کو کبھی منتقل ہوتا ہوا نہ پائیں گے۔''

<u>مذکورہ بالا اصول کا خلاصہ</u>: اِن ہٹ دھرم کافروں نے بڑی زوردار قسم کھائی تھی کہ اگر اِن کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول آ جائے‘ جو انہیں اللہ کے عذاب سے ڈرائے‘ تو وہ یہود ونصاریٰ اور دوسرے لوگوں سے زیادہ سیدھی راہ پر چلنے والے اور حق کی پیروی کرنے والے بن جائیں گے۔ پھر جب حضرت محمد ﷺ تشریف لے آئے تو وہ حق سے بہت دور ہو گئے اور اس سے نفرت کرنے والے بن گئے۔ ان کی قسمیں کوئی اچھی نیت سے نہیں تھیں اور نہ ہی وہ حق کے طلب گار تھے۔ وہ تو بس لوگوں کے مقابلے میں تکبر کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔ وہ تو بری تدبیر کرنا‘ دھوکہ دینا چاہتے تھے اور باطل پرست تھے۔ اور برے مکر کا نقصان مکر کرنے والے پر ہی آتا ہے۔ کیا یہ متکبر اور مکر کرنے والے اسی عذاب کے منتظر ہیں جو ان سے پہلی قوموں پر آ چکا ہے؟ تمہیں اللہ کا طریقہ کبھی بدلا ہوا نہیں ملے گا‘ اور نہ ہی منتقل ہوگا۔ کسی کے پاس کوئی ایسی طاقت نہیں ہے کہ وہ اللہ کے عذاب کو اپنے اوپر سے یا کسی دوسرے سے ٹال دے۔

قرآنِ کریم نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ کافروں کا مکر وفریب والا طریقہ اللہ کے نبیوں اور رسولوں (علیہم السلام) کے ساتھ رہا ہے‘ فرمایا:

﴿وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿۴۶﴾﴾ (ابراھیم)

''یہ اپنی اپنی چالیں چل رہے ہیں اور اللہ کو ان تمام چالوں کا علم ہے۔ اور ان کی چالیں ایسی تھیں کہ اُن سے پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائیں۔''

افراد کے حوالے سے قرآنِ کریم میں اس اصول کو واضح کرنے والی بہت ساری مثالیں موجود ہیں‘ لیکن ہم چند ایک ہی بیان کریں گے۔ مثلاً:

(۱) اللہ تعالیٰ نے اُس سازش کا ذکر فرمایا ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اُن کے خلاف کی تھی۔ سوچیے کہ انجام کار کیا ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۰۲﴾﴾ (یوسف)

''آپ ان کے پاس نہ تھے جب کہ انہوں نے اپنی بات ٹھان لی تھی اور وہ فریب کرنے لگے تھے۔''

یہ بات برحق ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے توبہ کر لی تھی' لیکن اپنے والد اور اپنے بھائی کو مختلف قسم کی تکلیفیں دینے کے بعد۔ چنانچہ ان کی ساری سازش کا نتیجہ الٹ نکلا۔ جس نے صبر کیا اور معاف کر دیا اس کا انجام بہت اچھا ہوا اور بہت سارا متبرک مال ملا۔

(۲) جب مشرکوں نے ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ کو تکلیفیں دینے کے لیے مختلف قسم کی سازشیں کیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا:

﴿وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ۭ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝۳۰﴾ (الأنفال)

''(اور اس واقعے کا بھی ذکر کیجیے!) جب کہ کافر لوگ آپ کی نسبت تدبیر سوچ رہے تھے کہ آپ کو قید کر لیں یا آپ کو قتل کر ڈالیں یا آپ کو جلاوطن کر دیں۔ اور وہ تو اپنی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر کر رہا تھا۔ اور سب سے مستحکم تدبیر والا اللہ ہے۔''

چنانچہ انجام کار میں آپ ﷺ کو کامیابی ہوئی۔

(۳) جب بنی اسرائیل کے لوگ سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے تو فرعون نے کس قدر سازشیں کی تھیں۔ اور جن لوگوں کے خلاف سازش ہوئی ان میں سے ایک آدمی وہ تھا جسے ''فرعون کے قبیلے کا مؤمن'' کہا گیا ہے' جس کے واقعے کو اللہ تعالیٰ نے سورۂ غافر (المؤمن) میں ذکر کیا ہے۔ فرمایا:

﴿فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْۗءُ الْعَذَابِ ۝۴۵ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۣ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝۴۶﴾

''پس اسے اللہ تعالیٰ نے تمام بدیوں سے محفوظ رکھ لیا جو انہوں نے سوچ رکھی تھیں اور فرعون والوں پر بری طرح کا عذاب الٹ پڑا۔ آگ ہے جس کے سامنے یہ ہر صبح وشام لائے جاتے ہیں' اور جس دن قیامت قائم ہوگی (فرمان ہوگا کہ) فرعونیوں کو سخت ترین عذاب میں ڈالو۔''

اللہ تعالیٰ نے اس مؤمن کو تو محفوظ رکھا البتہ فرعون اور اس کے لشکر اب تک عذاب میں ہیں' بلکہ جس وقت سے مرے ہیں' ان کو عذاب مل رہا ہے اور قیامت تک ملتا رہے گا۔

لوگوں کے واقعاتی حالات میں بھی اس کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ جیسے کچھ معاملات میں حیلے

کے ذریعے سود کھانے والوں کے واقعات ہیں' یا حرام نکاح کا حیلہ ہے' اور اس قسم کے بہت سارے واقعات ہیں۔ تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ جو سازشی بن کر زندہ رہا وہ فقر ومحتاجی میں مرا۔

اسی لیے بنی اسرائیل کے جن لوگوں نے حرام طریقے سے شکار کا حیلہ کیا' اللہ تعالیٰ نے ان کو سزا دی اور انہیں بندر اور خنزیر بنا دیا اور جن لوگوں نے سود کے ذریعے لوگوں کا مال کھانے کا حیلہ کیا' ان کی سزا کے طور پر ان کے مال کو ملیا میٹ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۭ﴾ (البقرۃ:۲۷۶)

''اللہ تعالیٰ سود کی جڑ مار دیتا ہے اور صدقات کو ترقی دیتا ہے۔''

اور یہاں پر اصول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جرم کرنے والوں کی سزا یہ رکھی ہے کہ جس مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر اس نے جرم کیا نتیجہ اس کے مقصود کے الٹ نکل آیا۔ چنانچہ سود کھانے والا اپنا مال بڑھانا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کے مقصود کے برخلاف اس کی سزا رکھی ہے۔ (یعنی اس کے مال کو ملیا میٹ کر دیا۔) اللہ تعالیٰ نے بندوں کے اندر نظامِ کائنات کی یہ سنت رائج کر دی ہے کہ جو باطل کی خاطر سازش کرے گا اس کے خلاف بھی سازش ہو جائے گی' اور جس نے حیلے سے کام لیا اس کے خلاف بھی حیلے ہو جائیں گے' اور جس نے دوسروں کو دھوکہ دیا وہ خود بھی دھوکہ کھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ﴾ (النساء: ۱۴۲)

''بے شک منافق اللہ تعالیٰ سے چالبازیاں کر رہے ہیں اور وہ انہیں اس چالبازی کا بدلہ دینے والا ہے۔''

نیز فرمایا:

﴿وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ۭ﴾ (فاطر:۴۳)

''اور بری تدبیروں کا وبال ان تدبیر والوں پر ہی پڑتا ہے۔''

نتیجہ یہ ہے کہ ہر حیلہ ساز کے خلاف بھی حیلہ ہو جائے گا' دھوکہ دینے والا بھی دھوکہ کھائے گا اور سازشی کے خلاف بھی سازش ہوگی۔

انیسواں اصول

﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝﴾

''عقلمندو! قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے تاکہ تم (قتلِ ناحق

سے) رکے رہو۔''

لوگوں کے درمیان معاملات کے حوالے سے یہ ایک بہت ہی اہم اصول ہے۔ جن کی اکثریت کسی نہ کسی شکل میں دشمنی اور زیادتی کا شکار ہوئی ہے' خواہ یہ زیادتی جان پر ہوئی ہو یا مال پر۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے بعد یہ عظیم اصول بیان ہوا ہے' فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ۭ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ۭ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاۗءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ۭ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۭ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ (البقرة)

''اے ایمان والو! تم پر مقتولوں کا قصاص لینا فرض کیا گیا ہے۔ آزاد آزاد کے بدلے' غلام غلام کے بدلے اور عورت عورت کے بدلے۔ ہاں کسی کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معافی دے دی جائے تو اُسے بھلائی کی اتباع کرنی چاہیے اور آسانی کے ساتھ دیت ادا کر دینی چاہیے۔ تمہارے ربّ کی طرف سے یہ نرمی اور رحمت ہے۔ اس کے بعد بھی جو سرکشی کرے اُسے دردناک عذاب ہوگا۔''

پھر اسی عظیم اصول کو دوسروں پر زیادتی کرنے کے باب میں بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾ (البقرة)

''عقلمندو! قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے تاکہ تم (قتل ناحق سے) رکے رہو۔''

ہمارے لیے اس عظیم قرآنی قاعدے پر رک کر غور کرنے کے مقامات ہیں:

مقامِ اوّل: جو شخص دنیا بھر کے ملکوں (خواہ وہ مسلمان ملک ہیں یا کافر) کے حالات پر غور کرے گا تو اُسے یہ نتیجہ ضرور ملے گا کہ جو ملک قاتل کو قتل کر دیتے ہیں وہاں پر قتل کی شرح کم رہتی ہے۔ اس بات کا اعتراف کئی اہلِ علم نے کیا ہے' اور اس کا سبب بیان کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ قصاص قتل کے جرم کو کم کرنے کے لیے بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ اور یہی بات اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیت میں بیان فرمائی ہے۔ جب کہ دشمنانِ اسلام کا خیال ہے کہ قصاص کی سزا حکمت کے خلاف ہے' اس لیے کہ پہلے انسان کے قتل کے بعد دوسرے انسان کے قتل سے آبادی میں کمی واقع ہوگی' لہٰذا قاتل کو قتل کرنے کے بجائے کوئی دوسری سزا دے دی جائے'

چنانچہ اُسے قید کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح دورانِ قید اگر اس کے ہاں بچہ پیدا ہو تو آبادی میں اضافہ ہو جائے گا۔ یہ سب بے فائدہ باتیں ہیں' جن کا حکمت و دانش سے دور دور تک کا بھی واسطہ نہیں' اس لیے کہ قید و بند کی سزا کسی کو قتل کے جرم سے نہیں روک سکتی۔ جب تک سزا صحیح معنی میں دل کو دہلا دینے والی نہ ہو' تو ناسمجھ لوگوں کی طرف سے قتل کی واردات ہوتی رہے گی۔ نتیجتاً قتل کی کثرت کی وجہ سے آبادی تیزی سے کم ہوتی رہے گی۔

دوسرا مقام: اس محکم قرآنی اصول میں بیان کیا گیا ہے: ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ﴾ ''اور قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے''۔ فطرۃً ہر انسان کو زندگی سب سے زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ چنانچہ قتل کی سزا سے زیادہ کوئی سزا بھی ڈرانے' دھمکانے اور جرم سے باز رکھنے کے لیے کارگر نہیں ہو سکتی۔

اس میں دوسری حکمت یہ ہے کہ مقتول کے ورثاء کو اطمینان رہے گا کہ نظامِ قضاء اس شخص سے خود بدلہ لے گا جس نے ان کے مقتول پر زیادتی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ﴾ (الاسراء)

''اور جو شخص مظلوم ہونے کی صورت میں مار ڈالا جائے' ہم نے اُس کے وارث کو طاقت دے رکھی ہے' پس اُسے چاہیے کہ مار ڈالنے میں زیادتی نہ کرے۔ بے شک وہ مدد کیا گیا ہے۔''

یعنی یہ نظام ہم نے اس لیے بنایا ہے تاکہ مقتول کے وارث خود ہی اپنے رشتہ دار کے قاتل سے بدلہ لینا نہ شروع کر دیں' اس طرح تو دو قبیلوں میں جنگ کی شکل بن جائے گی اور بہت ساری جانوں کا ضیاع ہوگا۔

تیسرا مقام: اس قرآنی قاعدے میں ''حیاۃ'' یعنی زندگی کا لفظ استعمال ہوا ہے' فرمایا: ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ﴾ ''اور قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے''۔ معنیٰ یہ کہ قصاص لینے میں تمہاری جانوں کا بچاؤ اور تحفظ ہے۔ یقیناً حکمِ قصاص نافذ کرنے کی صورت میں یہ دوسری جانوں کے قتل ہونے میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ اگر قصاص کا حکم نافذ نہ کیا جائے تو لوگوں کو کسی قسم کا خوف نہیں رہے گا۔ اس لیے کہ موت کا ڈر ہی وہ شے ہے جس کی وجہ سے لوگ حادثات سے گھبراتے ہیں۔ جب قاتل کو معلوم ہو کہ وہ موت سے بچ جائے گا تو

دوسری سزاؤں کی پروا کیے بغیر وہ قتل کرتا رہے گا۔

جیسا کہ زمانۂ جاہلیت میں ہوا کرتا تھا' اگر لوگوں کو خود سے بدلہ لینے کا موقع دے دیا جائے تو لوگ حد سے آگے بڑھ جائیں گے اور پھر ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے گا' جس کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہے حکم قصاص کے نافذ کرنے میں ہی دونوں گروہوں کی زندگی ہے۔

چوتھا مقام: اس اصول کا اختتام اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر ہو رہا ہے: ﴿ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ﴾ ''اے عقل و دانش والو!'' ان الفاظ کے ساتھ قصاص کی حکمت پر غور کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ عقل والوں کو مخاطب کرنے کا معنی یہ ہے کہ یہ بات صرف عقل والے ہی سمجھ سکتے ہیں' اس لیے کہ ظاہر میں تو سزا بھی جرم ہی طرح کی ہے' کیونکہ قصاص میں بھی تو ایک دوسری جان کا ضیاع ہے' لیکن اگر گہرائی میں جا کر غور کیا جائے تو قصاص زندگی کی ضمانت ہے' نہ کہ جان کا ضیاع ہے' جس کے دلائل گزر چکے ہیں۔

پھر فرمایا: ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝۱۷۹﴾ ''تاکہ تم (جرم کرنے سے) بچے رہو''۔ ایسی سزا مقرر کرنے کا فائدہ بیان فرما دیا' تاکہ تم جرم سے بچے رہو اور مقتول کا بدلہ لینے میں عدل و انصاف کی حد سے آگے نہ بڑھو۔

بیسواں اصول:

﴿وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ۭ﴾

''جسے اللہ ذلیل کر دے اُسے کوئی عزت دینے والا نہیں۔''

انصاف اور بدلے کے حوالے سے یہ بہت ہی مستحکم اصول اور قاعدہ ہے اور اس اصول پر غور کرنے سے مؤمن کی سوچ پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ جو کچھ بھی وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے' یا تاریخ کی کتابوں میں پڑھتا ہے' یا دنیا میں رہنے والوں کے ساتھ مرورِ زمانہ سے ہوتا ہے' یہ صورتِ حال ایک انسانی جان کے ساتھ بھی ہوتی ہے اور مختلف گروہوں کے ساتھ بھی۔ یہ وہی قرآنی اصول ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے واضح ہے' فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ۭ﴾ (الحج:۱۸)

''جسے اللہ ذلیل کر دے اُسے کوئی عزت دینے والا نہیں۔''

جس آیتِ کریمہ میں یہ اُصول بیان ہوا اُس آیت کو مکمل بیان کرنے سے اہانت کی

تصویر اور زیادہ واضح ہو جائے گی' جس میں انسان اپنی بلندی سے نیچے کو آتا ہے۔ فرمایا:

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَاۗبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ۭ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۭ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاۗءُ ۝۱۸﴾ (الحج)

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ کے سامنے سجدے میں ہیں سب آسمانوں والے اور سب زمین والے اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان بھی۔ ہاں بہت سے وہ بھی ہیں جن پر عذاب کا مقولہ ثابت ہو چکا ہے۔ جسے اللہ ذلیل کر دے اسے کوئی عزت دینے والا نہیں۔ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔''

اس آیتِ کریمہ کی تلاوت کے بعد' کیا تمہیں بھی میرے ساتھ اس حقیقت کا علم ہو گیا ہے کہ کسی بندے کا سب سے اعلیٰ مقام' سب سے خوبصورت شکل' سب سے زیادہ مقامِ عزت و احترام اپنے رب کی توحید میں اور تنہا اُسی رب کی عبادت کرنے میں ہے' کہ وہ اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز ہو اور اپنے خالق و مالک رب کے سامنے عاجزی اور اسی کی چاکری کرے۔ اس ذات کے ہاتھ میں ہی انسان کی نجات و فلاح کا فیصلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حق کے اعتراف کے ساتھ وہ یہ سب کچھ کرے' اُسی سے فضل کا امیدوار ہو اور اُسی کی سزا سے ڈرتا رہے۔

کیا تمہیں یہ بات بھی معلوم ہوئی ہے کہ انسان کی سب بڑی ذلت' رسوائی اور گھٹیا پن یہ ہے کہ وہ اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز ہونے سے انکاری ہو جائے یا اپنے خالق کے ساتھ کسی اور کو شریک بنائے؟ اور یہ ساکت و جامد پہاڑ' درخت اور گویائی سے محروم جانور اس انسان سے بہتر قرار پائیں' کیونکہ وہ اپنے خالق اور معبودِ حقیقی کو سجدہ کرتے ہیں؟

ذرا غور کرو کہ کن الفاظ کے ساتھ عذاب کا تذکرہ ہوا ہے' فرمایا: ﴿وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ﴾ ''جسے اللہ رسوا کر دے''۔ یہ نہیں فرمایا: ''جسے اللہ سزا دے دے''۔ واللہ اعلم' اہانت سے مراد کسی کو ذلیل کرنا' حقیر بنانا اور رسوا کرنا ہوتا ہے اور یہ کیفیت کسی سزا کی تکلیف سے زیادہ بڑی چیز ہے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کسی عزت دار کو سزا تو مل جائے' لیکن رسوائی نہ ہو۔

جب یہ طے پا گیا کہ انسان کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا' اپنے آپ کو ذلیل کرنے کی سب سے بڑی اور اپنے آپ کو اہانت کی کھائیوں میں پھینکنے والی صورت ہے' تو اس کے

ساتھ ساتھ کچھ اور صورتیں بھی ہیں' اگرچہ وہ شرک سے کم کم ہیں' البتہ بندے کی توہین میں ان کا اثر بھی ظاہر و واضح ہے' اور وہ ہے گناہ کی ذلت اور اس کی وجہ سے انسان کی اہانت۔

امام ابن قیم الجوزیہ رحمہ اللہ اسی محکم قرآنی قاعدے کی وضاحت کرتے ہوئے اور گناہ کی نحوست اور نقصانات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(۱) گناہ کرنے سے انسان کی قدر و قیمت اپنے رب کے سامنے ختم ہو جاتی ہے اور وہ اُس کی نظروں سے گر جاتا ہے۔ اور جب بندہ اپنے رب کے سامنے ہی بے وقعت ہو جائے تو کوئی اُس کی عزت نہیں کرتا' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ﴾ (الحج:۱۸) ''جسے اللہ ذلیل کر دے تو اُسے کوئی عزت دینے والا نہیں''۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ لوگ بظاہر اُس کی عزت کریں کہ لوگوں کی بعض ضرورتیں اُس کے ذریعے پوری ہوتی ہوں یا اُس کے شر کا خوف ہو۔ فی الواقع گناہگار شخص لوگوں کی نظروں میں بہت ہی حقیر اور بے وقعت ہوتا ہے۔

گناہ کی سزا بیان کرتے ہوئے مزید فرمایا:

(۲) اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں سے گناہگار کے رعب کو مٹا دیتا ہے اور وہ بے قیمت ہو جاتا ہے اور لوگ اسے بہت ہی ہلکا لیتے ہیں' جیسا کہ اُس نے اللہ کے حکم کو ہلکا لیا ہے اور اُس کی کوئی قدر نہیں کی۔ جس قدر بندہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرے گا اُسی قدر بندے اُس سے محبت کریں گے' اور جس قدر بندہ اللہ سے ڈرے گا اُسی قدر لوگ اُس سے ڈریں گے' اور جس قدر بندہ اللہ تعالیٰ اور اُس کی محترم چیزوں کی تعظیم کرے گا' اُسی قدر لوگ اُس کی اور اُس کی محبوب چیزوں کی عزت کریں گے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ تو اللہ تعالیٰ کی محترم چیزوں کو پامال کرے اور لوگوں سے امید کرے کہ وہ اُس کی عزتوں کو پامال نہ کریں؟ اور یہ بھی کیسے ہو سکتا ہے وہ تو اللہ تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرے اور اللہ تعالیٰ اُسے لوگوں پر بے وقعت نہ بنا دے؟ اور یہ بھی کیسے ہو سکتا کہ وہ تو اللہ کی معصیت دھڑلے سے کرے اور اللہ کی مخلوق اس کو بے وقعت نہ کرے؟ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جب گناہوں کی سزا کا ذکر کیا ہے تو اس بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے' اور یہ کہ اُس نے گنہگاروں کی ساری کمائی کو اُلٹا کر کے رکھ دیا ہے اور ان کے دلوں پر پردہ ڈال دیا ہے اور ان کے گناہوں کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے' اور جیسے یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو بھولے ہوئے تھے' اللہ بھی انہیں بھول گیا ہے۔ اور جیسے انہوں نے اللہ کے دین کو بے قدر سمجھا تھا اللہ تعالیٰ نے بھی انہیں حقیر سمجھ لیا ہے' اور جیسے ان

لوگوں نے اللہ کے حکم کو ضائع کر دیا تھا' اللہ نے بھی انہیں ضائع کر دیا ہے۔

اور اس اصول ﴿وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ﴾ (الحج/۱۸) ''جسے اللہ ذلیل کر دے اُسے کوئی عزت دینے والا نہیں'' کا معنیٰ یہ ہے کہ جس آدمی کو شریعت کی ظاہری و باطنی تابعداری کرنے اور اپنے رب کی اطاعت کرنے کی وجہ سے اللہ نے عزت بخشی ہو' وہی صحیح معنی میں عزت دار اور کرامت دار ہے' خواہ کافروں اور منافقوں نے اس کے خلاف ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ہو۔ منافقوں اور ان کے ہمنوا لوگوں کی آنکھوں کے نورِ بصیرت کو اللہ تعالیٰ نے چھین لیا' اور ان کے بارے میں فرمایا:

﴿يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَاۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ؕ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۝۸﴾ (المنافقون)

''یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم اب لوٹ کر مدینہ جائیں گے تو عزت والا وہاں سے ذلت والے کو نکال دے گا۔ سنو! عزت تو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے اور اُس کے رسول کے لیے اور ایمان والوں کے لیے ہے' لیکن یہ منافق جانتے نہیں۔''

اللہ کی قسم! واقعتاً یہ نہیں جانتے کہ حقیقی عزت دار کون لوگ ہیں۔

خاتمہ: اس محکم قرآنی اصول کے آخر میں شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی قیمتی بات نقل کر رہا ہوں' آپؒ نے فرمایا:

''دین پر ڈٹ کر کھڑے ہونے سے ہی حقیقی عزت ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی بندے کو اس سے بڑی عزت نہیں دی کہ اپنے محبوب اور رضا والے کاموں کی اُسے توفیق دے دی' اور وہ ہے اللہ کی اطاعت' اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت' اللہ کے ولیوں کی محبت اور اللہ کے دشمنوں سے دشمنی۔ درحقیقت یہی اللہ تعالیٰ کے سچے اور سچے ولی ہوتے ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے: ﴿اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۝﴾ ''سن لو کہ اللہ کے دوستوں کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ ہی کوئی غم۔''

(جاری ہے)

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا

عورت کا مقام ومرتبہ

محمد رشید عمر

عورت کے نام سے جسے ہم جانتے ہیں' اس ہستی کا مقام اور مرتبہ کم تر نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً ۚ﴾ (النساء:۱)

''اے لوگو! اپنے پروردگار کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کی بیوی کو پیدا کر کے ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں.....''

﴿فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ﴾ (آل عمران:۱۹۵)

''ان (کی دعا) کو ان کے رب نے شرفِ قبولیت بخشا (اور فرمایا) کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کرتا' چاہے وہ مرد ہو یا عورت' تم ایک دوسرے سے ہو.....''

﴿وَهُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّفْقَهُوْنَ ﴿۹۸﴾﴾ (الانعام)

''وہی ہے جس نے تم کو ایک نفس سے پیدا کیا پھر تمہارے لیے ایک تو مستقل ٹھکانہ ہے اور ایک کچھ دیر (اماناً) رکھے جانے کی جگہ۔ ہم نے ان آیات کو کھول کر بیان کیا ہے ان لوگوں کے لیے جو سمجھ بوجھ سے کام لیتے ہیں۔''

حجۃ الوداع کے موقع پر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

''.....کسی عربی کو عجمی پر' عجمی کو عربی پر' گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔''

یہ تعلیمات واضح کرتی ہیں کہ کسی مرد کو کسی مرد پر یا کسی عورت کو کسی عورت پر فضیلت حاصل نہیں' بلکہ کسی مرد کو کسی عورت پر یا کسی عورت کو کسی مرد پر بھی برتری حاصل نہیں۔ سب باہمی طور پر برابر کی عزت اور احترام کے مستحق ہیں۔ برتری کا معیار صرف اور صرف تقویٰ ہے۔ البتہ جیسے کسی کی ذمہ داری ہے ویسے اس کے حقوق ہیں۔ مرد کو اللہ تعالیٰ نے ایک درجہ فضیلت دی ہے' اسے عورتوں پر قوام بنایا ہے۔ دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے اللہ تعالیٰ کا یہ ایک انتظامی فیصلہ ہے۔ اسلامی معاشرے میں عورت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ شرعی ذمہ داریوں کے ساتھ ایک نفع بخش کردار بھی ادا کرے اور **المرأة الصالحة** کا عملی نمونہ بن جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خاوند کی تابع فرماں اور غیر موجودگی میں بھی اس کے مفادات کا تحفظ کرنے والی بن کے رہے۔ اگر وہ برضا و رغبت یہ ذمہ داری ادا کرنے پر تیار نہ ہو تو مرد کو اللہ تعالیٰ نے یہ حق دیا ہے کہ وہ اس کو اس پر عمل پیرا کرائے۔ مرد کی معاونت کے لیے اس سے دو صفات مطلوب ہیں: فرمانبرداری اور گھر پر عفت وعصمت کی حفاظت۔ عورت میں کم صلاحیتیں رکھ کر مرد کے مقابلے میں اس پر ذمہ داری کا بوجھ بھی کم رکھا گیا ہے۔ اور دوسری طرف اپنی بندگی کے لیے اللہ تعالیٰ عورت میں دس صفات دیکھنا چاہتا ہے۔ (ملاحظہ ہو سورۃ الاحزاب' آیت ۳۵) گویا خواتین کے لیے تو معاملہ کچھ اس طرح کا ہے ع

زنوری سجدہ می خواہی ' زخاکی بیش ازاں خواہی!

یعنی عورتوں سے ایک طرف اپنے خاوندوں کی اطاعت گزاری اور ان کو خوش رکھنا مطلوب ہے تو دوسری طرف اپنے مالک حقیقی کو راضی کیے بغیر چارہ نہیں۔

قرآن مجید جب یٰٓاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اور یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کہہ کر خطاب کرتا ہے تو اس سے یہ مطلب تو نہیں کہ عورتیں اس کا مخاطب نہیں ہیں۔ انسان ہونے کے ناطے عورتیں بھی اس میں شامل ہیں۔ پھر بھی انسانی فہم کی کوتاہی کو سامنے رکھتے ہوئے کئی مقامات پر مردوں کے ساتھ خصوصی طور پر خواتین کو بھی اپنے خطاب میں شامل فرمایا ہے۔ جیسے مردوں کے لیے اجر وثواب کے وعدے ہیں اسی طرح ان کے لیے بھی بہترین بدلہ اور جنت میں اعلیٰ درجات کی خوشخبریاں ہیں۔

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَمَسٰكِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ

الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۷۲﴾ (التوبۃ)

''ایمان دار مَردوں اور ایمان دار عورتوں سے اللہ تعالیٰ نے ان جنتوں کا وعدہ فرمایا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اور ان صاف ستھرے محلات کا جوان ہمیشگی والی جنتوں میں ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضا سب سے بڑی چیز ہے۔ یہ زبردست کامیابی ہے۔''

ایمان والی عورتوں کو یقین کامل ہے کہ ان کا رب ان سے آخرت میں کوئی امتیازی سلوک نہیں کرے گا۔ جس طرح وہ اپنے فرماں بردار مردوں کو نوازے گا اسی طرح عورتیں بھی اس کی نعمتوں سے محروم نہیں رہیں گی۔ آج سے ہزاروں سال پہلے فرعون کی بیوی کو یقین کامل حاصل تھا کہ وہ اپنے رب کی بندگی کا حق ادا کرے گی تو جنت میں اسے بہترین ٹھکانے سے نوازا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس فرمانبردار بندی کی دعا کو قرآن مجید میں شامل کر کے ہمارے لیے مثال قائم کر دی ہے۔

﴿وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۱﴾﴾ (التحریم)

''اور اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کے لیے فرعون کی بیوی کی مثال بیان کی ہے، جبکہ اس نے دعا کی: اے میرے رب میرے لیے اپنے پاس جنت میں مکان بنا اور مجھے فرعون سے اور اس کے عمل سے بچا اور مجھے ظالم لوگوں سے خلاصی دے۔''

اس سورۂ مبارکہ میں فرعون کی بیوی کے علاوہ حضرت مریم (سلام علیہا) کا ذکر بھی ہے (آیت ۱۲)۔ مزید برآں حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام کی بیویوں کا بھی ذکر ہے (آیت ۱۰)۔ فرعون کی بیوی اور حضرت مریم کو اہلِ ایمان کے لیے بطور مثال پیش کیا گیا ہے۔ جبکہ حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام کی بیویوں کی مثال کافروں کے لیے پیش کی گئی ہے۔ ان کے مقام اور مرتبوں کی بات اللہ تعالیٰ کی اطاعت کیشی اور بندگی کے حوالے سے ہے نہ کہ خاوندوں کی اطاعت کے حوالے سے۔ اگرچہ بیوی ہونے کے ناطے سے خاوند کی اطاعت عورت کی ذمہ داریوں میں شامل ہے اور اللہ کے ہاں اس کا یہ رویّہ علوِ شان کا ذریعہ ہے۔ انتہائی ناموافق حالات میں بھی اللہ کی بندگی کا حق ادا کرنے کی وجہ سے فرعون کی بیوی کو

اہل ایمان کے لیے بطور مثال پیش کیا ہے۔ یہ مثال کس لیے ہے؟

غور کیجیے اگرچہ یہاں خطاب ''اہلِ ایمان'' کے الفاظ سے ہے، لیکن اصل تو یہ مثال خواتین کے لیے ہے کہ جس طرح نامساعد حالات میں اس اللہ کی بندی نے حق بندگی ادا کیا تھا اسی طرح تمہیں بھی تمام تحفظات اور مجبوریوں کے باوجود اللہ کی بندگی کا حق بھی ادا کرنا ہو گا۔ اس لیے کہ اُس کا فرمان ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾﴾ (الذّٰریٰت)

''میں نے جنّوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اپنی بندگی کے لیے۔''

یہ حق بندگی جس طرح مرد کے لیے لازم ہے اسی طرح عورت بھی اپنے رب کی بندگی کا طوق گلے سے نہیں اتار سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے مرد کے مقابلے میں اسے جو مقام دنیا میں دیا ہے اور اس کی خلقی صورت میں جو کمزوریاں رکھی ہیں اس کے باوجود وہ اس ذمہ داری سے بریُ الذمہ نہیں قرار دی جا سکتی۔ جب بندگی کا فریضہ اس سے ساقط نہیں تو اجر و ثواب اور جنت کی نعمتوں سے بھی اس کا رب اسے راضی کر دے گا اگرچہ ہمارا مبلغ علم اس کا احاطہ نہ کر سکے۔

آیئے اب ذرا غور کریں، اللہ تعالیٰ نے عورت کو جو مختلف روپ بیٹی، بہن، بیوی اور ماں کی صورت میں دیے ہیں، ان میں کیا حکمتیں اور چھپے ہوئے فائدے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے چودھویں رات کی خنکی اور ایک پُرسکون کیفیت ہے جو احساسات پر چھا جاتی ہے، جس میں ماں چودھویں کے چاند کی مانند اور بیٹی، بہن اور بیوی ستاروں کی مانند جھلملاتی نظر آتی ہیں۔ بقول علامہ اقبال ؎

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ!

مکمل حقیقت یہ ہے کہ وجودِ زن سے فانی کائنات ہی رنگین نہیں ہے بلکہ ابدی اور دائمی حیاتِ اُخروی بھی اسی کے وجود سے معطر ہے۔ بیٹی کا مقام دے کر پدرانہ شفقت کے ساتھ کسی بچی پر نظر ڈالیے، پھر اس نظر کو اپنے قلب کی طرف لوٹایئے۔ جس طرح آیاتِ قرآنیہ دل کے زنگ کو دور کر دیتی ہیں، یہ پدرانہ شفقت والی پلٹی ہوئی نظر دل کے میل کو دور کر دے گی۔ ہونا بھی ایسا ہی چاہیے کہ فرمانِ نبوی ﷺ ہے:

((مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتّٰى تَبْلُغَا، جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَنَا وَهُوَ)) وَضَمَّ اَصَابِعَهٗ

(صحیح مسلم، ح: ۲۶۳۱، راوی: انس بن مالك رضی اللہ عنہ)

''جس نے دو بیٹیوں کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ بالغ ہوگئیں' قیامت کے دن میں اور وہ اس طرح آئیں گے: آپ ﷺ نے دو انگلیوں کو ملا کر اشارہ فرمایا۔''

اور

((مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَنْظُرُ اِلٰى مَحَاسِنِ امْرَأَةٍ اَوَّلَ مَرَّةٍ ثُمَّ يَغُضُّ بَصَرَهُ اِلَّا اَحْدَثَ اللّٰهُ لَهُ عِبَادَةً يَجِدُ حَلَاوَتَهَا)) (مسند احمد' راوی: ابو امامہ رضی اللہ عنہ)

''جس مسلمان کی نظر کسی عورت کے حسن پر پہلی مرتبہ پڑے اور وہ نگاہ ہٹا لے تو اللہ تعالیٰ اس کی عبادت میں لطف اور لذت پیدا کر دیتے ہیں۔''

اسی طرح بہن کا رشتہ آیاتِ الٰہیہ میں سے ایک بہت بڑی آیت ہے۔ بہنوں کی موجودگی میں ہمارے احساسات کس طرح پاک اور صاف ہوتے ہیں کہ ''عوراتُ النساء'' پر اٹھی ہوئی نظر پر بھی تقدس اور خلوص کا رنگ ایسا غالب ہوتا ہے کہ دل کا آئینہ میلا نہیں ہوتا۔ صلبی بہنوں کے علاوہ بھی جہاں رشتۂ اخوت روبعمل ہوتا ہے انسان کی نظریں جھک جاتی ہیں۔ بہنوں کی موجودگی میں ان کا تقدس اور احترام نفسیاتِ انسانی پر اس طرح غالب ہوتا ہے کہ اسے ضبطِ نفس کی معراجی کیفیت کا تجربہ ہو جاتا ہے' جس کے لیے فرمایا گیا:

﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ﴿١٧﴾﴾ (النجم)

''نظر نہ بھٹکی اور نہ سرکش ہوئی۔''

یہی سمجھئے اس رشتے کی حقیقت کو جو ہمارا اس دنیا اور مافیہا سے ہے۔ ہم دنیا سے فائدہ اُٹھائیں' لیکن اس کی طرف اُٹھی ہوئی نظریں ہمارے دل کو اللہ سے غافل کرنے کی حد تک متاثر نہ کر پائیں۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ۭ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿١٣١﴾﴾ (طٰہٰ)

''اپنی نگاہیں ہرگز اُن چیزوں کی طرف نہ دوڑانا جو ہم نے ان میں مختلف لوگوں کو آرائش دنیا کی دے رکھی ہیں' تاکہ انہیں اس میں آزمائیں۔ آپ کے ربّ کا دیا ہوا رزق بہت بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔''

﴿لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٨٨﴾﴾ (الحجر)

''آپ ہرگز اپنی نظریں اس چیز کی طرف نہ دوڑائیں جس سے ہم نے ان میں سے کئی قسم کے لوگوں کو بہرہ مند کر رکھا ہے نہ ان پر افسوس کریں' اور مؤمنوں کے لیے اپنے بازو جھکائے رکھیں۔''

عورت ایک ایسا مدرسہ ہے جو انسان کو دنیا میں رہنے کا سلیقہ سکھلا دے۔ آخرت میں اس انسان کو جس نے اپنے رب کی بندگی کا حق ادا کیا ہوگا' اللہ تعالیٰ اپنے اور اپنے رسول ﷺ کے قرب سے محروم نہیں کرے گا۔ بیوی کے روپ میں اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی تکمیل کی ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے ایک ایسا انسان جو بیساکھی کے سہارے کے بغیر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ چل نہیں سکتا۔ بیوی کے روپ میں اللہ تعالیٰ نے مرد کو ایک مضبوط سہارا فراہم کیا ہے۔ اگر یہ سہارا نہ ہو تو مرد قعرِ مذلّت میں گر جائے' اور یہ قعرِ مذلت بے راہ روی اور آزاد جنسی شہوت رانی ہے۔ یہی وہ رشتہ ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اس کُرۂ ارضی کی آبادکاری کی ہے۔ جن معاشروں میں بیوی کے رشتے کا احترام نہیں وہاں سے انسانیت اخلاقی اعتبار سے اور عددی اعتبار سے بھی ختم ہو رہی ہے۔

قرآن مجید میں والدین کے حقوق کو اللہ تعالیٰ نے اپنے حقوق کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿١٣﴾ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰي وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ۭ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿١٤﴾﴾ (لقمٰن)

''اور جب لقمان نے وعظ کہتے ہوئے اپنے بیٹے سے فرمایا کہ میرے پیارے بچے! اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا' بے شک شرک بڑا بھاری ظلم ہے۔ اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے متعلق نصیحت کی ہے' اس کی ماں نے دکھ پر دکھ اٹھا کر اسے حمل میں رکھا اور اس کی دودھ چھڑائی دو برس میں ہے کہ تو میری اور اپنے ماں باپ کی شکرگزاری کر۔ تم سب کو میری طرف لوٹ کر آنا ہے۔''

جس طرح ایک مؤمن اور سلیم الفطرت انسان کے سامنے حقوق اللہ واضح ہیں اسی طرح ماں باپ کی عزت و تکریم اس کے تحت الشعور میں گہری جڑی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ خواب میں انسان کو دونوں یا کوئی ایک نظر آ جائے تو ان کی عزت و تکریم کے جذبہ سے سرشار ہو کر

نیازمندی کے پر اُن کے قدموں تلے بچھا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید اور حدیث مبارکہ کے مجموعۂ ہدایت کو دیکھیں تو والد سے زیادہ والدہ حسن سلوک کی مستحق نظر آتی ہے۔ اسلام کے عادلانہ نظام کے قیام کے لیے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اپنی جانوں اور مالوں سے بھی دریغ نہ کریں‘ سب کچھ قربان کر دیں‘ تاکہ دین غالب ہو اور معاشرہ صفاتِ الٰہیہ کے ظہور کا ذریعہ بن جائے۔ جبکہ ماں تو ایسی ہستی ہے جس کا وجود اللہ تعالیٰ کی صفاتِ محبت و شفقت کا مظہر اتم ہے اور اُس کی صفتِ تخلیق کے اظہار میں تو عورت جان کی بازی لگا دیتی ہے۔ ظلم اور جہالت کے معاشروں میں بھی ماں کے وجود سے اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا ظہور جاری رہتا ہے۔ ماں کا پیٹ انسانی وجود کی تخلیق کا کارخانہ ہے۔ یہ وہ کارخانہ ہے جس میں تمام انبیاء کرام علیہم السلام اور نبی آخر الزماں ﷺ کے وجودِ مبارک کی نوک پلک سنوار کر دنیا میں لایا گیا۔ تو ایک ہستی جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کی صفات کی مظہر ہو اور اللہ نے دنیا میں اس کے حقوق کو اپنے حقوق کے ساتھ رکھا ہو‘ ایسی فرماں بردار بندی کو کیا اللہ تعالیٰ اپنے قرب سے محروم کر دے گا‘ جبکہ حدیث کی رو سے وہ جنت جس کو بندۂ مومن کی وراثت کہا گیا ہے وہ ماں کے قدموں تلے ہے۔

جس نے دنیا میں والدین میں سے دونوں یا کسی ایک کو پایا پھر ان سے محبت و شفقت اور ہمدردی کا سلوک نہ کیا‘ تو ایسا شخص آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور نجات سے محروم رہ جائے گا۔

یہ چند باتیں اس لیے عرض کی ہیں کہ ہمیں صنف نازک کے حقوق اور ان کے حوالے سے اپنی ذمہ داریاں سمجھ میں آ جائیں۔ عورتوں کے مقام و مرتبہ کے بارے میں فکری کجی کا شکار ہونے والوں کی خدمت میں قرآن مجید کی اس آیت مبارکہ پر بات ختم کر رہا ہوں:

﴿اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ ﴿۷۷﴾ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِیَ خَلْقَهٗ ؕ قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ ﴿۷۸﴾﴾ (یٰسٓ)

’’تو کیا انسان کو معلوم نہیں کہ ہم نے اسے نطفے سے پیدا کیا ہے‘ پھر یکایک وہ صریح جھگڑالو بن بیٹھا۔ اور ہمارے بارے میں مثال بیان کرتا ہے اور اپنی اصل پیدائش کو بھول گیا! کہتا ہے کہ کون زندہ کرے گا ہڈیوں کو جبکہ وہ بالکل بوسیدہ ہو چکی ہوں گی؟‘‘

❁❁❁

میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

میں گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ گویا روشنی کی کسی ایک کرن کا بھی کہیں کوئی وجود نہیں۔

﴿ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَاۤ اَخْرَجَ یَدَهٗ لَمْ یَكَدْ یَرٰىهَا ؕ﴾

’’اندھیرے ہی اندھیرے ہیں ایک دوسرے کے اوپر‘ جب وہ اپنا ہاتھ نکالتا ہے تو اسے بھی نہیں دیکھ سکتا۔‘‘

مطلق تاریکی (absolute darkness) کی اس کیفیت کو اردو محاورے میں یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ ایک فرنچ ایڈمرل اس آیت کو پڑھ کر مسلمان ہو گیا تھا۔ اس کی ساری عمر سمندروں میں گزری تھی اور پانی کے نیچے absolute darkness کی کیفیت اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ یہ آیت پڑھ کر اسے بجا طور پر یہ تجسّس ہوا کہ کیا محمد (ﷺ) نے بحری سفر بھی کیے تھے؟ اور جب اسے معلوم ہوا کہ آپؐ نے کبھی بھی کوئی بحری سفر نہیں کیا تو اس نے اعتراف کر لیا کہ یہ اُنؐ کا کلام نہیں اللہ کا کلام ہے‘ کیونکہ ایسی تشبیہہ تو صرف وہی شخص دے سکتا ہے جو سمندر میں غوطہ خوری کرتا رہا ہو اور سمندر کی گہرائی میں اندھیروں کی کیفیت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہو۔

﴿وَمَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴿۴۰﴾﴾ ’’اور جس کو اللہ نے ہی کوئی نور عطا نہ کیا ہو تو اس کے لیے کہیں کوئی نور نہیں ہے۔‘‘

یعنی وہ لوگ جن کی زندگیاں ملمع کی نیکیوں سے بھی خالی ہیں ان کے لیے اندھیرے ہی اندھیرے ہیں۔

❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
’’بیان القرآن‘‘ کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں‘
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

ہماری بچیاں کیسی تعلیم حاصل کریں؟

بیگم ڈاکٹر عبدالخالق

والدِ محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ نے اپنی بیٹیوں کو دنیا کی تعلیم سکول اور کالج میں نہیں دلوائی' بلکہ الحمدللہ گھر میں ہی بذریعہ استاد دنیوی اور دینی علوم سکھانے کا بندوبست کیا' جس کی وجہ سے سکول و کالج کی تعلیم میں ناگزیر غیر نصابی سرگرمیوں اور لغویات کی جگہ جنرل نالج سیکھنے کا موقع بھی ملتا رہا اور والدین کی زیرسرپرستی ونگرانی بہت سے دینی و دنیوی معاملات' جو بظاہر الگ الگ محسوس ہوتے ہیں' کو دین کے سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھا۔ چنانچہ معروف ومنکر کی پہچان' شرم وحیا' ستر وحجاب اور بچپن میں ہی سر کے ساتھ ساتھ سینوں پر دوپٹہ ڈالنے کی عادت پختہ ہوگئی جو سکول و کالج کے ماحول میں سوچی بھی نہیں جاسکتی۔ یہ بات میں اس لیے بتا رہی ہوں کہ آج دینی علوم سیکھنے کے باوجود بھی بہت سی خواتین یا کالجز اور یونیورسٹیوں میں تعلیم مکمل کر لینے والی لڑکیاں ان عادات کو پختہ بنانا تو درکنار' ان کی اکثریت سینوں پر دوپٹہ ڈالنا بھی ضروری نہیں سمجھتی' جبکہ وہ جانتی ہیں کہ قرآن میں غضِ بصر کے علاوہ خواتین کے لباس میں سینوں پر دوپٹہ ڈالنے کا حکم الگ اور واضح انداز میں آیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۪﴾ (النور: ۳۱) ''اور چاہیے ان عورتوں کو کہ وہ اپنے سینوں پر اپنے دوپٹے ڈال لیا کریں۔''

اولاد کی تعلیم کے ضمن میں سب سے پہلے خود والدین کا نیک اور باعمل ہونا ازحد ضروری ہے اور یہ کہ وہ خود سنجیدگی سے اور شعوری طور پر یہ فیصلہ کریں کہ ہم نے اپنے بچوں کو عیسائی یا ہندو بنانا ہے یا پھر ایک صحیح اور اچھا مسلمان' اور پھر استقامت سے اپنے موقف پر قائم رہیں۔ دوسرے نمبر پر یہ بات بہت ضروری ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کے مستقبل اور دائرۂ کار کے حوالے سے ان کی تعلیم وتربیت کا بندوبست کریں۔ اسی حوالے سے یہ بات بھی اچھی طرح جان لینی چاہیے کہ ہوم سکولنگ ہو یا کسی سکول اور کالج میں بچے پڑھتے ہوں' بچے کے اچھے یا

برے بننے میں بہت بڑا کردار ان کے والدین کا ہوتا ہے۔ خصوصاً والدہ کا کردار وعمل اور اخلاق بچے کے دل ودماغ پر بہت زیادہ اثرانداز ہوتا ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

کہ آغوشِ مادر ہے اسکول پہلا جہاں تربیت پاتے ہیں سارے اعضا
جہاں لوحِ سادہ پہ کھنچتا ہے نقشہ اترتا ہے ماں کے خیالوں کا چربہ

بہرحال بہت سا پانی وقت کے ساتھ سر سے گزر جانے کے بعد اب باشعور والدین کے دل ودماغ میں یہ تصور شدت کے ساتھ زور پکڑتا جا رہا ہے کہ دجالی دور کے بڑھتے ہوئے فتنوں اور جالوں میں لڑکیاں دجالیت کا بہت مضبوط اور کارگر مہرا ثابت ہو رہی ہیں اور نوجوانوں خصوصاً لڑکیوں میں مادہ پرستی کے جال میں تعلیم کے حصول کا اصل مقصد مال ودولت کا حصول اور وہ ذریعہ معاش ہے جس سے وہ مادر پدر آزاد اور آزادیٔ نسواں کی علمبردار بن کر مَردوں کے شانہ بشانہ چلتی ہوئی نظر آئیں اور اپنے مقصدِ حیات اور دائرہ کار کو بالکل فراموش کر دیں۔ چنانچہ بہت سی ڈگری ہولڈر لڑکیاں' جو دینی گھرانوں سے بھی تعلق رکھتی ہیں' صرف اس مقصد کے لیے تعلیم حاصل کرتی ہیں کہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہوسکیں۔ لیکن ع ''کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا'' اور ؎

''نہ خدا ہی ملا وصالِ صنم نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے!''

کے مصداق ان میں سے اکثر وبیشتر کی زندگی ایک 'گواچی گاں' کی طرح ٹامک ٹوئیاں مارتے گزر جاتی ہے۔ ازدواجی زندگی میں بھی ناکام ہوتی ہیں اور اپنی ڈگری کے ساتھ بھی ظلم کرتی ہیں۔ لہٰذا ان لڑکیوں کے لیے ان کے دائرۂ کار اور میدانِ عمل اور لڑکوں کے لیے ان کے مستقبل کے حوالے سے تعلیم حاصل کروانا تمام والدین کے لیے ازحد ضروری ہے۔ اس میں قصور ہم والدین کا بھی ہے کہ ہماری بچیوں نے جو خواہش کی ہم نے اسی طرح کی تعلیم دلوانے کا اہتمام کر دیا۔

ہماری ایک سوچ یہ بھی ہے کہ لڑکیاں ڈاکٹر بن کر کم ازکم اپنے جیسی خواتین کا علاج کریں گی اور انہیں مردوں کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اسی خدمت خلق کا 'جذبہ' لے کر اور اس سوچ کو بنیاد بنا کر ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر لیتی ہیں' لیکن اس پانچ سالہ تعلیم کے دوران نوّے فیصد لیڈی ڈاکٹرز ایک متکبّرانہ ذہن کی ڈگری حاصل کر رہی ہوتی ہیں۔ مریضوں کے ساتھ جلادوں اور قصائیوں والا سلوک اور اخلاق میں اکھڑ مزاج ڈاکٹرز تیار ہو رہی ہوتی ہیں۔

سرکاری ہسپتالوں میں تو الامان والحفیظ‘ جبکہ پرائیویٹ ہسپتالوں میں پیسے بنانے کے لیے اخلاق اچھا کرنا پڑتا ہے!! بہرحال اس ڈگری کا ایک اور منفی پہلو یہ ہے کہ اکثر و بیشتر خواتین‘ مرد ڈاکٹرز سے علاج کروا رہی ہوتی ہیں اور کچھ کو لیڈی ڈاکٹرز ہی مردوں کے پاس بھیج دیتی ہیں۔ گائنی کے علاوہ ہر فیلڈ میں زیادہ تر مرد ڈاکٹرز ہی عورتوں کا علاج کر رہے ہوتے ہیں۔ اس بات کا تذکرہ اس لیے ضروری ہے کہ لڑکیاں مَردوں کی سیٹیں بھی مار لیتی ہیں اور کوالیفائڈ ہونے کے باوجود پوری طرح علاج میں دسترس نہیں رکھ رہی ہوتیں۔ اور سب سے بڑا ظلم یہ کہ اپنی خاندانی زندگی میں شوہر کے حقوق اور بچوں کے حقوق سے بالکل ناواقف ہونے کی وجہ سے ناکام گھریلو زندگی گزارتی ہیں اور اکثر و بیشتر ذہنی و نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہو جاتی ہیں۔

لہٰذا خدارا اپنی بچیوں‘ بلکہ اپنی پوری نسل کو ان دجالی ہتھکنڈوں سے بچانے کی کوشش کریں اور انہیں ایسی تعلیم دلوائیں جو ان کو نہ صرف بہترین بچیاں بنائے بلکہ تادمِ آخر انہیں بہترین‘ کامیاب اور ماہر مائیں اور بیویاں بھی بنائے۔ آج کے تعلیمی ادارے اکثر و بیشتر (مخلوط ہوں یا الگ الگ) روحانی قتل گاہیں اور حیوانی و جبلی خواہشات کی تکمیل کی درس گاہیں بن چکی ہیں۔ خاص طور پر ہماری یونیورسٹیاں‘ جہاں والدین کو داخل ہونے بھی نہیں دیا جاتا‘ کہ کہیں وہ دیکھ نہ لیں کہ ہماری اولاد کیا گل کھلا رہی ہے۔ ان سب پر مستزاد یہ ظلم ہے کہ ایسے انتہائی مشکوک ماحول میں ایسی تعلیم و تربیت دی جاتی ہے جو ان کو اللہ‘ اللہ کے رسول ﷺ اور قرآن مجید کے احکامات سے دور رکھتی ہیں۔

ان سب کے باوجود ہم اپنی بچیوں کو گھروں میں فارغ بھی نہیں بٹھا سکتے۔ اس کا ایک سبب تو یہ فارسی محاورہ ہے: ’’خانہ خالی را دیو می گیرد‘‘ (خالی گھر کو جن بھوت اپنا بسیرا بنا لیتے ہیں)۔ اس کا دوسرا سبب یہ ہے کہ عالمی سطح پر ہم مسلمانوں کا image بہت ہی خراب ہو چکا ہے اور ہم دنیا میں بنیاد پرست‘ تنگ نظر‘ شدت پسند اور انتہا پسند‘ جیسے القابات سے پہچانے جاتے ہیں اور ہم نہیں جانتے کہ باہر کا یہ ’’دیو‘‘ اندر کے دیو سے کتنا بڑا خطرناک ہے۔ چنانچہ بچوں اور بچیوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ پیراستہ کرنا بہت ضروری ہے۔ گھروں میں بٹھانا اور تعلیم نہ دلوا کر بلاوجہ دنیا کی نظریں اپنے اوپر مرکوز (focus) کرنے والی بات ہے۔ چنانچہ انہیں تعلیم ضرور دلوائیں اور ڈگریاں بھی دلوائیں‘ کیونکہ ڈگریوں کی کشش (attraction)

ہماری نظروں میں بہت زیادہ ہے۔ لیکن سب سے بڑھ کر وہ ڈگریاں ہیں جو وہ سکول‘ کالجز اور یونیورسٹیوں میں بھی حاصل نہیں کر سکتیں‘ بلکہ یہ ڈگریاں صرف اور صرف ایک اچھی ماں سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ وہ ڈگری ایک لڑکی کا شادی کے بعد سسرال جا کر پوری زندگی گزارنا ہے‘ جہاں تین محاذ (۱) شوہر داری‘ (۲) بچہ داری‘ اور (۳) خانہ داری منہ کھولے تیار ہوتے ہیں۔ اگر اس بارے میں تعلیم حاصل نہیں کی تو یقین کریں کہ ہم پڑھے لکھے جاہل ہیں۔ یہی وہ اصل پلیٹ فارم ہے جہاں تادمِ آخر لڑکی کو زندگی گزارنی ہے کہ اگر وہ بیوی بن گئی ہے تو کیا فرائض ہیں‘ بچے ہو جائیں تو ان کے کیا فرائض ہیں اور گھر والوں کے ساتھ (سسرال/یا الگ) ہیں تو کیا حقوق و فرائض ہیں۔ چنانچہ اس تناظر میں والدین سے گزارش ہے کہ بچیوں کو ان کی مَن مانی تعلیم دلوانے کی بجائے انہیں مندرجہ بالا علوم سے آراستہ و پیراستہ کریں تاکہ وہ کامیاب بیویاں‘ مائیں اور سلیقہ منداور کفایت شعار گھر والیاں بن سکیں۔

ذیل میں لڑکیوں کی تعلیم کے حوالے سے کچھ تجاویز دی جا رہی ہیں۔ میری محدود سوچ کے مطابق ان پر عمل کر کے یقیناً بہتر نتائج سامنے آ سکتے ہیں اور ان پر ہوم سکولنگ اور سکول میں داخلے‘ دونوں صورتوں میں عمل ہو سکتا ہے:

(۱) پرائمری تک بچوں کو سکول ضرور بھیجیں‘ لیکن ایسے سکولز کا انتخاب کریں جہاں دنیوی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم بھی دی جاتی ہو۔ اس تعلیم کے دوران بچوں کا ناظرۂ قرآن مع تجوید پورا کرائیں‘ روزانہ تلاوت اور پانچ وقت کی نماز کا عادی بنائیں۔ وضو‘ طہارت اور اچھے اخلاق پر عمل کریں بھی اور کروائیں بھی‘ اور ان کو کوئی انعام وغیرہ بھی دینے کی عادت ڈالیں۔ اچھے اخلاق میں سے صادق اور امین ہونا بہت بنیادی اور زندگی میں بہت کارآمد اوصاف ہیں۔ ادعیہ ماثورہ اور چھوٹی چھوٹی سورتیں رات کو سوتے وقت یاد کروانے اور سننے کا عادی بنائیں۔ بچوں کو خود والدین‘ خصوصاً والدہ ضرور ٹائم دیں۔ ان کے ساتھ کھیلیں اور سب سے بڑھ کر پیار محبت اور اچھے اخلاق کا دامن نہ چھوڑیں۔ خود سچ بولیں‘ مبالغہ نہ کریں اور جھوٹے وعدے نہ دلائیں۔ آخرت کے حوالے سے اللہ سے محبت‘ جزا اور سزا کا خوف بھی انہیں بچپن سے ہی دلائیں۔

قرآنی تعلیمات کے مطابق یہ عمر ’’لَعِبٌ‘‘ کے درجے میں آتی ہے۔ لہٰذا کھیل کود‘ بھاگ دوڑ‘ گیمز (جو بالکل صاف ستھری ہوں) وغیرہ کے لیے ان کو ٹائم بھی دیں اور خود بھی ان کے ساتھ کھیلیں۔ بچوں کو کمپیوٹر اور لیپ ٹاپ پر اچھائی اور برائی کی پہچان کروائیں اور کمپیوٹر پر کوئی

تخلیقی کام (creative work) بھی کروائیں تا کہ بچہ الٹ پلٹ چیزیں کم از کم دیکھے۔ بچوں کو برائی سے نفرت دلائیں ایسے ہی جیسے ہم گندگی کو دیکھ کر ناک منہ چڑھاتے ہیں۔ پھر بچوں کے لباس پر خصوصی توجہ رہے۔ خود بھی ساتر یعنی 'لِبَاسُ التَّقْوٰی' زیب تن رکھیں اور اپنی بیٹیوں کو بھی ساتر لباس پہنائیں۔ آپ کے اس طرح کرنے سے وہ شروع سے ہی شرم وحیا کے زیور سے آراستہ ہوں گی۔ گھروں میں سلام کو بھی خوب رواج دیں' ہمیشہ سچ بولیں اور بچوں کو بھی سچائی کا درس دیں۔ بڑوں کا ادب اور کہا ماننا اور چھوٹوں سے محبت اور پیار کرنا سکھائیں۔ والدین اپنی اولاد کی غلطیوں پر معاف کرنا سیکھیں اور سکھائیں۔ اسی طرح بچوں کو خاموشی سے اذان سننے کی عادت ڈالی جائے' پھر خود بھی اذان کا جواب دیں اور بعد میں دعا پڑھیں' اس لیے کہ اذان کے دوران خاموش رہنا اور جواب دینے کی تاکید ہمیں سنت نبویؐ سے ملتی ہے۔

(۲) مڈل اور میٹرک کی تعلیم بھی گھروں اور سکولوں دونوں میں دلوائی جاسکتی ہے' لیکن اگر گھر میں تعلیم سکھائیں تو وقت کی بہت زیادہ بچت ہو جاتی ہے' وقت میں برکت ہو جاتی ہے۔ گھر میں اگر سائنس کے بجائے دوسرے مضامین کے ساتھ میٹرک کروالیں تو بہت اچھا ہے۔ اس دوران بچوں کو قرآن کا ترجمہ یاد کروا دیا جائے' جبکہ سکول میں داخلے کے بعد ہر ماں اور بچی کی زبان پر ایک ہی بات ہوتی ہے کہ ہمارے پاس ابھی وقت نہیں ہے۔ یہ اتنا بڑا دھوکہ ہے جو ہم ایک دوسرے کو دیتے ہیں' حقیقت یہ ہے کہ صرف اس پڑھائی کا آخرت میں کچھ اجر ملنے والا نہیں ہے۔ یہ عمر قرآنی ہدایت کے مطابق ''لَھْوٌ'' کے درجے میں آتی ہے جس میں کھیلوں اور دوسرے مشاغل میں تبدیلی آنا شروع ہو جاتی ہے' دلچسپیوں کے انداز بدل جاتے ہیں۔ ایک ماں اپنے بچوں کے ذہنوں اور صلاحیتوں سے پوری طرح واقف ہوتی ہے۔ اس عمر میں بچوں (بیٹے ہوں یا بیٹیاں) کے دوست بننا از حد ضروری ہوتا ہے۔ لہجے میں بہت زیادہ نرمی اور سختی کے درمیان اعتدال میں رہنا بہت بہتر ہوتا ہے۔ اسلامی کتب کا مطالعہ کرنے کی عادت ڈالیں اور انٹرنیٹ پر چھوٹے چھوٹے اسلامی کلپس بچیوں کو دکھائیں تا کہ کمپیوٹر ہاتھ میں ہو تو مصرف بھی اچھا ہو۔ ان کو بتائیں کہ کمپیوٹر اور موبائل وغیرہ باقی کاموں کے ساتھ تبلیغ ودعوت کا ذریعہ بھی ہیں اور ﴿اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ.....﴾ کی بہترین تشریح بھی۔ کمپیوٹر وغیرہ کے دوران ہمارے کان' آنکھیں اور دماغ کام کر رہا ہوتا ہے' چنانچہ ان کے بارے میں ہی قرآن نے بار بار فرمایا ہے کہ اللہ کے ہاں پوچھا جائے گا۔ لہٰذا اپنے لیے ان ذرائع سے بہترین

گواہیاں اکٹھی کرو —— بچوں کو اربعین نووی یاد کروائیں۔ سورۃ الکہف' سورۂ یٰسٓ' سورۃ الواقعۃ' سورۃ الملک وغیرہ جیسی عام طور پر پڑھی جانے والی لیکن ذرا لمبی سورتیں یاد کروائیں۔ ایمان باللہ کی آبیاری آیاتِ آفاقی وانفسی کے ذریعے کروائیں۔ ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت کو یقین محکم اور عمل پیہم کے ذریعے دوام دیں۔

اس عمر میں دنیا بہت رنگین ہو کر سامنے آتی ہے' لہٰذا اچھے طریقے اور بہترین حکمت عملی کے ساتھ ان کے جائز فیشن اور جائز میک اپ کو ساتر لباس کے ساتھ تسلیم کرتے ہوئے ان کو حیادار بنانے کی بھی کوشش کریں۔ دوپٹے کو خصوصاً سینوں پر اچھی طرح پن لگا کر اوڑھنے کی عادت پختہ بنائیں۔ اگر ہماری بچیاں سکولوں میں پڑھ رہی ہیں تو وہاں جا کر ہم سٹینڈ لے سکتے ہیں کہ ہماری بچیاں سکارف اور باریک پٹی کے بجائے پورا دوپٹہ لیں گی۔ ان کو سمجھایا جائے کہ ہمارا دین عملی دین ہے جیسے کہ سائنس اور اس کے عملی تجربات۔ سائنس کی کاپی کے ایک طرف لائنیں اور دوسری طرف کے صفحات تجربے کے لیے صاف ہوتے ہیں' بالکل اسی طرح اپنے بچوں کو دین کا علم سکھائیں اور پھر ساتھ ہی ان کے صاف ذہنوں میں عمل کرنا سکھائیں کہ یہ پریکٹیکل ہے اور اس کے بغیر ہم ادھورے ہیں۔

(۳) ایف اے سے لے کر بی اے اور ایم اے تک کی عمر قرآن کی رہنمائی کے مطابق ''زِیْنَۃ'' کے درجے میں آتی ہے' جس میں اپنا آپ دکھانا اور ''میرے جیسا کوئی نہ ہو'' جیسے خیالات بچیوں کو گھیرے رکھتے ہیں۔ اس عمر میں تفسیر قرآن' حقوق وفرائض (والدین کے حقوق' اولاد کے حقوق' شوہر کے حقوق' بیوی کے حقوق) سے آگاہی از حد ضروری ہے اور یہ لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لیے ناگزیر ہے کہ حقوق وفرائض کا پتا چلے اور اپنے اپنے فرائض کو دیانت داری سے کما حقہ ادا کرنا' بچوں کو شادی سے پہلے اچھی طرح ازبر کروا دیں۔ پھر جو بات خود ہمیں بھی آج تک سمجھ نہیں آئی' جس کی وجہ سے گھر برباد ہو رہے ہیں وہ بچوں کو پہلے ہی بتانا بہت ضروری ہے' وہ یہ کہ ایک شوہر چار شادیاں بھی کر سکتا ہے اور یہ حق اس کو اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ اسی طرح اسلام میں جوائنٹ فیملی سسٹم نہیں ہے' لہٰذا بہو کو الگ گھر دینا اُس کا حق ہے جو پورا کیا جانا چاہیے۔

بچیوں کو اسلامیات' عربی' انگلش اور فلسفے وغیرہ میں ایم اے کروایا جا سکتا ہے تا کہ دنیوی تعلیم کی تشنگی پوری ہو سکے اور مصروفیت ہزار نعمت بھی ہے۔ اسی طرح تنظیم سے منسلک رفیقات کو

منتخب نصاب سمجھانا' بلکہ ''رجوع الی القرآن'' کورس کروانا بہت ضروری ہے تاکہ جب یہ کل کو ماں بنے گی تو اقامت دین کی جدوجہد سے بچوں کو آگاہ کرے اور پھر اولاد میں یہ فکر منتقل ہو سکے۔ عربی' انگلش اور فارسی زبان بچوں کو سکھائی جائے تو فی زمانہ بہت پڑھی لکھی اور ماڈرن سمجھی جائیں گی۔ میرے نزدیک یہ بہت ضروری ہے کہ میٹرک کے بعد خصوصاً عربی اور انگلش زبان ضرور سکھائی جائے اور یہ زبانیں ایف اے کے بعد ہی سکھا دی جائیں تو بہت مفید رہے گا۔ اور دین کے سانچے میں ان زبانوں کا استعمال اور ان میں اظہارِ خیال (Speaches) مطلوب بھی ہے اور پسندیدہ بھی۔

ہم چاہیں تو سکولوں اور کالجوں میں جائے بغیر بھی بہت سے علوم (دینی اور دنیوی) حاصل کر سکتی ہیں اور اپنا قبلہ درست کر سکتی ہیں۔ لڑکیوں کے والدین ان کے اندر یہ شعور بیدار کریں کہ روحانی اور مادی علوم کا منبع اور سرچشمہ تو ایک ہی ذاتِ باری تعالیٰ ہے اور اس ذات نے وحی کا آغاز بھی ''اِقرأ'' سے فرمایا ہے' لیکن ہماری بدقسمتی کہ ہم یہ نہ سمجھ سکے کہ مادی علوم کو روحانی علوم پر غالب کر دینا ہی اصل میں دجالیت ہے۔ مادی علوم' دینی اور روحانی علوم کے بغیر ہماری 'میں' اور 'نفس پرستی' میں اضافہ کرتے ہیں اور دجالیت بھی 'میں' اور 'نفس پرستی' کا نقطۂ عروج ہے۔

اس کی مثال قرآن سے دو شخصیات کی لی جا سکتی ہے۔ ایک تو رہتی دنیا تک کے بادشاہ کہ جن کی بادشاہت جیسی نہ کوئی تھی اور نہ ہو گی یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام جن کو اللہ تعالیٰ نے صرف انسانوں پر ہی نہیں' بلکہ جنّات' جانوروں' پرندوں' ہواؤں پر بھی بادشاہت عطا کی تھی لیکن وہ ہر صلاحیت پر فرماتے کہ ﴿هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ﴾ (النمل: ۴۰) ''یہ میرے رب ہی کے فضل سے ہے''۔ یہ روحانی علوم کا مادہ پرستی پر غالب آنا ہے' جبکہ فرعون اور قارون کو بھی اللہ نے بے پناہ اختیارات اور دولت عطا کی تو ان دونوں بدبختوں نے کفر کی روش اختیار کی۔ قارون نے کہا: ﴿اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ﴾ (القصص:۷۸) ''مجھے تو یہ سب کچھ ملا ہے اُس علم کی بنیاد پر جو میرے پاس ہے''۔ فرعون نے کہا: ﴿یٰٓاَیُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرِیْ﴾ (القصص:۳۸) ''اے درباریو! میں تو اپنے سوا تمہارے لیے کسی معبود کو نہیں جانتا''۔ یہ مادہ پرستی اور اپنی ''میں'' کو خدا بنا لینا ہی دجالیت ہے۔ یہی فرق حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دجال میں ہو گا۔ حضرت عیسیٰ کرامات اور معجزے لا کر ''اللہ کی عطا کردہ'' اور ''اللہ کے اذن''

کا لفظ استعمال کریں گے' جبکہ دجال کہے گا کہ یہ سب کچھ میری محنت اور 'ذہن و عقل' سے ہوا ہے۔

بہرحال دینی علوم کے ساتھ اپنے ایمان کی آبیاری کرتے ہوئے دنیوی علم حاصل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں' البتہ وہی علوم حاصل کیے جائیں جن کی لڑکیوں کو ضرورت ہے۔ یہ نہ ہو کہ ''کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا''۔ حقیقتاً ہم دنیا کی پڑھائی میں اس قدر غرق ہوتے ہیں کہ ہم بھول جاتے ہیں کہ ہمارا مقصد حیات محض یہ پڑھائی نہیں' بلکہ اللہ کی بندگی' ہمہ وقت غلامی' قرآن اور دین سیکھنا ہی مقصد حیات ہے۔

تنظیم اسلامی کے پلیٹ فارم سے دو سالہ ''رجوع الی القرآن کورس'' کروایا جاتا ہے جو ہمارا مقصدِ حیات واضح کرتا ہے اور ہمیں زندگی کو گزارنا سکھاتا ہے' نہ یہ کہ زندگی ہمیں گزارے۔ اس کورس میں ایک بہترین ماحول میں بچیاں پردہ کرنا سیکھتی ہیں' مختلف موضوعات پر لیکچر سنتی ہیں' اپنے ذہنوں میں واضح تبدیلی محسوس کرتی ہیں اور دین کی طرف عملاً راغب ہوتی ہیں۔ یہ عمر قرآنی ہدایت کے مطابق ''زِیْنَة'' کی صف میں آتی ہے کہ جب امیدیں' آرزوئیں' خواہشات جوان ہو چکی ہوتی ہیں اور شدت سے اپنا آپ دوسروں کو دکھانے کا جذبہ بیدار ہو رہا ہوتا ہے۔ یہی دور ہے جس میں ''فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِ'' کا جذبہ پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اہل خانہ کی خدمت کا جذبہ خصوصاً والدین کی خدمت اور ان کی دعائیں لینے کا جذبہ بیدار کرنا' بزرگوں کا کہنا ماننا اور ان کی ضروریات کا خیال رکھنے کا جذبہ زندہ کرنا اور رکھنا بہت ضروری ہے۔ اسی طرح شوہر کی خدمت کرنے کا شعور بیدار کرنا بھی بہت ضروری ہے۔ ہر بیٹی آج لڑکی ہے تو کل ماں اور پرسوں ساس کے روپ میں آتی ہے۔ تو ''جیسا کرو گے ویسا بھرو گے'' کے قاعدے پر عمل کرنا بہت ضروری ہے' لیکن ہر قسم کے خیر' نیکی' خدمت اور گھریلو کاموں میں للّٰہیت کا رنگ بھرنا از حد ضروری ہے۔ اس (جوانی کی) عمر میں اگر یہ چیز ہمارے پیش نظر رہے گی تو نہ گھریلو کام بھاری لگیں گے' نہ کسی کی خدمت کرنا گراں گزرے گا اور ہمارا رخ بھی آخرت کی طرف رہے گا۔ پھر کسی کا احسان لینے کی بجائے احسان کرنے کا جذبہ غالب رہے گا۔ ان شاء اللہ!

اللہ تعالیٰ ہمیں قرآنی احکامات اور تعلیماتِ نبویؐ کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

❁❁❁

تعلیم وتربیت کے ضمن میں

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی اہمیت

میجر (ر) حیدر حسن☆

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کالج میں داخلے کے بعد بھی گھر سے حکم یہی تھا کہ مغرب سے پہلے گھر میں پایا جانا ضروری ہے۔ آج جس ماحول کا ہم نہ چاہتے ہوئے بھی حصہ ہیں' اس ماحول میں اکثر والدین اپنے بچوں کو ایسا کوئی حکم دینے کے نہ تو اب مجاز ہیں اور نہ ہی بچے ایسی کوئی بات ماننے پر تیار۔ اکثر بچے شام کو گھر میں اس لیے بھی موجود نہیں ہوتے کہ سکول اور کالج کے ساتھ ساتھ اس وقت کسی اچھی اکیڈمی میں پڑھے بغیر بہتر گریڈ ملنے کی توقع عبث ہے۔ اور اگر بچے گھر میں ہوں بھی تو وہ اکثر کمپیوٹر' موبائل' یا ٹی وی پر نظریں جمائے ہوتے ہیں۔ تعلیم کے حصول کے ذرائع بھی اب یہی ہیں۔ اب سکول' کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کا مطلوب ومقصود ایک ہی ہے' بہتر سے بہتر گریڈ کا حصول۔ نظم وضبط' اخلاق' بہتر کردار اور اقدار کی اساتذہ سے شاگردوں میں منتقلی' اب ایک انہونی بات ہے۔ استاد اور شاگرد کا رشتہ ادب واحترام کا کم اور بے تکلفی اور دوستی کا زیادہ ہے۔ مجبوری دونوں طرف سے ہے۔ استاد کی تو اکثر معاشی مجبوری ہے جس کی وجہ سے وہ ایک سے زیادہ جگہوں پر پڑھانے پر مجبور ہے۔ اس لیے ایک بہت محدود وقت میں پڑھائی کے علاوہ کردار کی تعمیر کے لیے سوچ کیسے پیدا ہو؟ طلبہ کی مجبوری کہ جیسے بھی ہو اچھے گریڈ کا حصول مدنظر ہے۔ ابھی تک تو یہ ہمارا ایک نعرہ ہی ہے کہ ''تعلیم سب کے لیے'' حالانکہ ہم ایک مناسب' متوازن طریقہ اور ذریعہ تعلیم ہی طے نہیں کر سکے۔ جہاں تک ''سب کے لیے''.....تو ہنوز دلی...دور تر است!

پڑھائی پر اب اتنا زور ہے کہ جسمانی صحت' جو دماغی صلاحیت کو بھی جلا بخشتی ہے' اُس کی طرف توجہ بہت کم ہے۔ پہلے سکول' کالج اور یونیورسٹی میں مختلف کھیلوں کی ٹیمیں بہت اہمیت کی حامل تھیں اور ان ہی میں سے کئی کھلاڑی ملک کی مسلح افواج اور دوسرے اہم اداروں میں

☆ شعبہ تحقیق اسلامی' قرآن اکیڈمی' لاہور۔ majorhaider@yahoo.com

جاتے تھے اور وہاں مزید نکھار پیدا کر کے بین الاقوامی مقابلوں میں حصہ لے کر ملک کا نام روشن کیا کرتے تھے۔ بہتر گریڈ اور نمبروں کے حصول کے لیے غلط ہتھکنڈوں کا استعمال اب کوئی زیادہ منفی تاثر نہیں چھوڑتا۔ بس کسی پرچے کا ''آؤٹ نہ ہونا'' ضرور ایک 'بریکنگ نیوز' بن سکتی ہے۔ کیا اب بھی اُستاد کی کارکردگی کو شاگردوں کے نتیجے سے جانچا جاتا ہے؟ خیال رہے کہ یہ بات اصل میں سرکاری تعلیمی اداروں کو مثال بنا کر کہی جا رہی ہے۔ نجی ادارے اپنی ساکھ کو بہتر رکھنے کی کوشش اس لیے کرتے ہیں کہ وہ پیسہ کمانے کا ایک مکمل ذریعہ ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر نجی تعلیمی ادارے قائم نہ ہوتے تو تعلیم کے میدان میں ہم بہت پیچھے ہوتے۔ لیکن اس کا ایک بڑا منفی اثر یہ ضرور ہے کہ ایک سے زیادہ تعلیمی نظاموں کے باعث متوسط درجے اور غریب افراد کے بچوں کے لیے تعلیم کا حصول مزید دشوار ہو چکا ہے۔ تعلیم کے شعبے سے متعلق ایک تکلیف دہ کھرا سچ! سکندر مرزا کے عہد حکومت میں جب وزیروں میں محکمے بانٹے جا رہے تھے تو تعلیم کا قلم دان کسی کے سپرد کرنا تب یاد آیا جب تقریب ختم ہو گئی۔ اُس وقت ایک صاحب جو سانس کی بیماری کی وجہ سے سب سے پیچھے رہ گئے تھے' انہیں پکڑ کر وزیر تعلیم بنا دیا گیا۔

ہم ایک قوم نہیں بلکہ محض ایک ہجوم ہیں۔ ابھی بھی سنبھل سکتے ہیں۔ ہم میں صلاحیت کی کمی نہیں۔ تعلیم اور تربیت کے فقدان نے ہمیں ہجوم بنا رکھا ہے۔ نماز باجماعت ہماری تربیت کا مکمل نظام نہیں تو اور کیا ہے؟ صفائی' طہارت' پاکیزگی' (جسم' جان اور دل کی) پابندیٔ وقت' امام کی اقتدا اور مکمل اطاعت کے بغیر نماز باجماعت کا تصور محال ہے۔ اگر گھر اور منبر ومحراب سے صدقِ دل سے ان چار چیزوں پر عمل کرانے پر توجہ ہو جائے تو ہمیں منظّم ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

اسی قوم کے ماہرین نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان ''محسن پاکستان'' کی نگرانی میں دشمن کے مقابلے کے لیے اپنے ایٹمی گھوڑے تیار کیے اور دشمن کو کانوں کان خبر نہ ہوئی' الحمدللہ! ان گھوڑوں کو آزمانے کے لیے مکمل رازداری سے جو تیاری کی گئی' وہ مشکل مراحل کہوٹہ اور چاغی کی پہاڑیوں میں ہر طرف سونگھتے پھرتے دشمن کے کتوں کی نظر سے پوشیدہ رکھنا آسان نہ رہا ہوگا۔ یہ سب بہتر تربیت اور ذاتی مثال کے باعث ممکن ہوا۔ میں اُن دنوں کیپٹن تھا اور واہ کینٹ چھٹی پر آیا ہوا تھا۔ پاکستان آرڈیننس فیکٹری' واہ کینٹ میں ابا جان کے ایک ساتھی افسر اور بے تکلف دوست' جو خود بھی وہاں ایک انتہائی حساس ادارے کے انچارج تھے' سے ملنا

ہوا۔اُن کے دو بیٹے اُن دنوں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے ساتھ کام کر رہے تھے۔میں نے چچا جان سے دریافت کیا کہ اُن کے بیٹے آج کل کس شعبے میں کام کر رہے ہیں؟ اُن کے جواب نے مجھے ششدر کر دیا۔دونوں بیٹوں نے اُنہیں علیحدہ علیحدہ کہہ رکھا تھا کہ ''ابا جان یہ ہم سے کبھی نہ پوچھیے گا''۔یہ سب بہترین ذاتی کاوش' پرخلوص خدمت اور اعلیٰ ترین تربیت کا اثر تھا کہ اس ہجوم ہی میں سے ڈاکٹر خان نے لوگوں کو چنا اور پھر اُنہیں ہیرا بنا دیا۔

اسی ہجوم میں سے جو بیٹے کوئی سی بھی ایک فوجی وردی پہن لینے کے حق دار ٹھہرتے ہیں' وہ سب کا مان بن جاتے ہیں۔رکھوالے ایسے بنتے ہیں کہ ہماری حفاظت کرتے ہوئے اپنے ہی خون میں نہا لیتے ہیں۔ پاک مٹی اُوڑھتے وقت اپنوں کو غسل دینے کی تکلیف دینا بھی گوارا نہیں کرتے۔یہ سب بہتر تعلیم اور تربیت کا اثر ہے۔پشاور میں جب معصوم بچوں پر غیروں کے زرخرید گولیاں برسا رہے تھے تو ایس ایس جی کا ایک ریٹائرڈ جوان وہاں سے گزر رہا تھا۔اُس نے ایک سکیورٹی گارڈ سے شاٹ گن چھینی اور اندر جا کر وحشیوں کا مقابلہ کرنے لگا اور شہید ہو گیا۔اُس ریٹائرڈ جوان کو کیا ضرورت تھی' اس طرح قربان ہونے کی؟ یہ اثر تھا اچھی تعلیم و تربیت کا' اُس پاک خون کا جو ایک اچھے مسلمان کے وجود میں دوڑ رہا تھا۔

تیز رفتار اور زود اثر' مختلف منفی رویے ہمارے معاشرے کو تیز رفتاری سے بہت تشویشناک اخلاقی انحطاط سے دوچار کرتے چلے جا رہے ہیں۔اب شرم' جھجک' یا حیا نام کی چیز متروک ہوتی جا رہی ہے۔اس دور میں اچھے خاصے عزت دار' نامور' اور کھاتے پیتے گھرانوں کے ایسے افراد' جو ریاست کے اونچے ترین منصب پر بھی فائز رہے ہوں' کسی الزام کی بنیاد پر ایک تفتیشی محکمے یا پولیس کی تحویل میں کورٹ میں پیش ہونے جا رہے ہوں' تو وہ دو اُنگلیوں سے 'وکٹری' کا نشان بنا رہے ہوتے ہیں۔اُن کے اس عمل کو کیا نام دیا جائے؟ مزید یہ کہ نو دولتیوں کے سرمائے کی ریل پیل نے' جو اکثر حالات میں ناجائز ذرائع سے حاصل کیا گیا ہوتا ہے' معاشرے کی اقدار کو بری طرح سے ملیا میٹ کر دیا ہے۔اب اچھے بھلے' اللہ سے ڈرنے والے لوگ بھی حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر سیدھی راہ اختیار کرنے میں تذبذب کا شکار ہو جاتے ہیں۔

آج میڈیا خود مختار اور آزاد ہے۔اس آزادی کا سب سے زیادہ تاریک پہلو یہ ہے کہ دوپٹہ جو ہماری خواتین کی پہچان تھا' اب اُس کا نہ لینا ہمارے بیشتر ٹی وی چینلز پر جلوہ افروز

ہونے والی خواتین کا امتیازی نشان ہے۔شاید یہ ضمیر کی چبھن کو کم کرنے کا ایک جواز ہو کہ بالوں کی لٹوں سے دوپٹے کا کام بھی چلایا جاتا ہے۔دوپٹے کے بغیر خواتین نام نہاد مذہبی اور اصلاحی پروگراموں میں شرکت کرتی نظر آتی ہیں' اور وہاں موجود بہت سے اکابرین دین' بلا جھجک اُن سے گفتگو فرما رہے ہوتے ہیں۔پچھلے رمضان میں علماء حضرات کی موجودگی میں جو انعامی مقابلے مختلف چینلز پر دکھائے گئے اُن میں خواتین کی سج دھج' شرکاء کا ہلّہ گلّہ' اینکرز کی اُچھل کود کا رمضان المبارک کی حرمت سے کوئی تعلق؟ بہت مثبت بات کہ ضرورت مندوں کی مدد کی گئی۔امداد کا یہ سلسلہ سال کے دوسرے ایام میں بھی جاری رہنا چاہیے۔ہمارے میڈیا پر لچر اور فحش انڈین پروگرام دکھانے پر کوئی پابندی نہیں!!

آج جس ڈگر پر ہم تیزی سے رواں دواں ہیں وہ اُس سے بالکل مختلف ہے کہ جو راستہ اُس ابدی منزل کی طرف لے جانے والا ہے جس کی طرف راہ نمائی ہادیٔ برحق حضرت محمد ﷺ نے فرمائی۔ پاکستان اسلام کے نام پر بنا تھا۔کہنے کی حد تک تو ہم ایک مسلم معاشرے میں رہ رہے ہیں اور حکومت بھی شریفوں کی ہے' لیکن ہم محض ایک ہجوم ہیں' منظّم اور سلجھی ہوئی قوم نہیں۔مادر پدر آزادی نے معاشرے کو بالکل بے حس بنا دیا ہے۔کیا کوئی دن ایسا گزرتا ہے کہ جس دن کوئی گھناؤنی واردات نہ ہو؟ پولیس کی کارکردگی اور اہلیت کا گراف کیا ظاہر کرتا ہے؟ کیا ہم اللہ کی پکڑ کا انتظار کر رہے ہیں؟ عوام سے لاتعلق اشرافیہ اپنے مخصوص علاقوں اور اپنے قلعوں میں محفوظ ہے۔ملک کے حالات خواہ جس قدر بھی دگرگوں ہوں' اُن کے مشترکہ سیاسی اور خاندانی مفادات کو کوئی گزند نہیں پہنچتا' اپنے مفاد کے لیے وہ فوراً یکجا ہو جاتے ہیں۔یہ اقلیت اکثریت پر کاٹھی ڈالے ہوئے ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج ہر طرف ایک ابتری اور افراتفری ہے' بے حسی عام ہے۔دنیوی مشکلات ہیں کہ ہر طرف سے ہم پر اُمڈتی چلی آ رہی ہیں۔کیا یہ اللہ کے عذاب کی ایک صورت تو نہیں؟ اِس سے بچنے کی ایک ہی راہ ہے' یعنی نہی عن المنکر! اور عملی طور پر اُس کا کم سے کم درجہ ہے بِاللِّسَان یعنی زبان سے روکنا۔اس کے ساتھ ساتھ ضروری ہے کہ برائی کو ہاتھ سے روکنے کے لیے قوت بھی حاصل کی جائے۔اُس قوت کے حصول کے لیے ایک جمعیت کا ہونا لازمی ہے۔ایسی جمعیت کی فراہمی کے لیے جدوجہد جاری رہنی چاہیے۔اللہ کب اور کس سے کام لے' کسے توفیق دے' یہ اُسے ہی معلوم ہے۔ہم کوشش اپنی حد تک اور توفیق اللہ سے طلب کرتے رہیں۔

قطع نظر اس حقیقت کے کہ ماحول کیا ہے؟ کیسا ہے؟ اور دوسرے کیا کر رہے ہیں؟ ہم صرف اپنی ذاتی بھلائی کے لیے اپنے آپ کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش انفرادی طور پر جاری رکھیں۔ زمانۂ جاہلیت کیا تھا؟ نبی کریم ﷺ کی مبارک دعوت کے پھیلنے کے بعد وہ کیوں اور کیسے سب سے بہترین دور قرار پایا؟ وجہ یہ تھی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے درج ذیل ارشاد پر پوری دل جمعی سے عمل کیا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ (آل عمران)

''اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا کہ اُس کے تقویٰ کا حق ہے اور دیکھنا کہ تمہیں ہرگز موت نہ آنے پائے مگر اس حال میں کہ تم (اللہ کے) فرمانبردار ہو۔''

درج بالا خطاب مسلم معاشرے میں تقویٰ کو دنیا اور آخرت میں کامیابی کے لیے ضروری قرار دیتا ہے۔ اسی طرح دوسرے تمام معاشرے، خواہ وہ لادین ہوں یا کسی بھی مذہب کے پیروکار، وہ بھی ایک فرد کو اپنے رسم ورواج کا مکمل فرمانبردار اور قانون پر عامل ایک ذمہ دار شہری دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارے معاشرے کی نسبت دوسرے معاشروں میں قانون کی گرفت مضبوط ہے، جرمانے اور سزائیں سب کے لیے ہیں۔ ہمارے ہاں کی طرح وہاں استثناء کسی کو حاصل نہیں۔ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی کسی استثناء کے روادار نہ تھے۔ حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما امیر المؤمنین ہونے کے باوجود قاضی کی عدالت میں پیش ہوئے۔

درج بالا ارشادِ مبارک کی روشنی میں ہمیں خود کو بھی سدھارنا ہے اور ایک گھر کے سربراہ کی حیثیت سے ہم قادرِ مطلق کو جواب دہ بھی ہیں۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ اپنے گھر کو ''نہی عن المنکر'' کی مضبوط بنیاد پر استوار کریں۔ آپ کا اور میرا گھر ہی ایک زندہ اور فعال معاشرے کی بنیاد ہے۔ یہاں میں سکول، کالج اور یونیورسٹی کے اساتذہ اور منبر ومحراب سے اُٹھنے والی مثبت اور پُرخلوص آوازوں کو بعد کا معاملہ سمجھتا ہوں۔ آنے والی نسلوں کو مناسب تعلیم وتربیت کے ذریعہ سے بہتر ماحول دینا ہماری ذمہ داری ہے۔ اللہ ہمارا حامی وناصر ہو، آمین!

آج نہی عن المنکر سب سے اہم کیوں؟

نہی عن المنکر کے لغوی معنی ہیں ''اُن چیزوں سے روکنا جن کی شرعاً ممانعت ہے''۔ ہمیں حکم ہے کہ:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ یَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (آل عمران)

''تم میں سے ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہیے جو بھلائی کی طرف بلائے اور نیک کاموں کا حکم کرے اور برے کاموں سے روکے۔ اور یہی لوگ فلاح (اور نجات) پانے والے ہیں۔''

سورۂ آل عمران میں ایک اور ارشادِ مبارک اس طرح ہے:

﴿یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ ؕ﴾ (آیت ۱۱۴)

''یہ اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، نیک کاموں کا حکم کرتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں جلدی کرتے ہیں۔''

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ جنت میں داخلے کا دارومدار صرف اعمال پر نہیں، بلکہ رحمت اور مغفرتِ باری تعالیٰ بھی ضروری ہے۔ جب صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کیا آپؐ کے بارے میں بھی ایسا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں خود بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کا امیدوار ہوں۔ ہمارے لیے حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ اعمالِ صالحہ کرنے کی توفیق اس بات کی علامت ہے کہ اللہ راضی ہے اور اللہ تب راضی ہوگا جب ہم اس حکم پر عمل کریں گے:

﴿وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾ (آل عمران)

''اور حکم مانو اللہ کا اور رسول (ﷺ) کا تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔''

اچھے کاموں کی طرف بلانے والی اور برائی سے روکنے والی جماعت کا ذکر ماقبل ہو چکا ہے۔ لیکن ایک ارشادِ مبارک اس طرح ہے:

﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ (البقرۃ)

''کیا تم لوگوں کو بھلائیوں کا حکم کرتے ہو اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟ حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو۔ کیا اتنی بھی تم میں سمجھ نہیں؟''

اور سورۃ الصّف میں ارشاد ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾

''اے مسلمانو! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں؟''

لیکن اس سے مراد یہ بھی نہیں کہ دوسروں کو نیکی اور بھلائی کی تلقین خود پوری طرح کامل ہو کر ہی کی جائے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ساتھ ساتھ اپنی اصلاح بھی ہوتی رہنی چاہیے۔ نیکی اور بھلائی کی تلقین معاشرے کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے بہت ضروری ہے' لیکن آج کے حالات میں صرف نیکی کی تلقین کافی نہیں اور صرف وعظ کہنے سے بات نہیں بنے گی۔ حکم یہ ہے کہ:

﴿وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (لقمٰن:۱۷)

''نیکی کا حکم دو اور بدی سے روکو۔''

جب برائی ہوتی نظر آ رہی ہو تو طاقت میسر ہونے کی صورت میں اسے ہاتھ سے یعنی طاقت سے روکنے کی کوشش کی جائے۔ اگر طاقت سے روکنا بس سے باہر ہو تو اسے اپنی زبان (اور قلم) سے روکا جائے۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو کم از کم اُس برائی کو دل میں برا جانا جائے' اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ کسی فرد کو برائی سے روکنے کی تلقین اور نصیحت' رسوائی سے بچانے کے لیے تنہائی میں کی جائے اور یہ عمل مناسب طریقہ سے انجام دیا جائے۔ دوسروں کی عزتِ نفس کا خیال رکھنا تربیت کا بہت اہم پہلو ہے۔ اگر منکر سے روکتے روکتے اُس سے بڑا منکر پیدا ہو جائے تو یہ کہیں بڑا گناہ ہے۔

برائی سے روکنے کی اہمیت ایک حدیث کی مدد سے واضح کی جاتی ہے۔ اس حدیث کے راوی حضرت ابوسعید الخدری ؓ ہیں اور یہ صحیح مسلم کی روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''جو کوئی تم میں سے کسی برائی کو دیکھے تو وہ اُسے اپنے ہاتھ سے بدلے۔ لیکن اگر وہ اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو (یعنی وہ قوت نہیں رکھتا) تو اُسے زبان سے روکے''۔ یعنی مذمت کرے' اُس پر تنقید کرے' زبان سے بدلنے کی کوشش کرے۔ آج کے دور میں تحریر اور تقریر بھی اسی ضمن میں آتی ہے ــــ ''لیکن اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو (یعنی زبانوں پر قدغنیں لگا دی گئی ہوں' قلم پر پہرے ہوں) تو پھر اپنے دل میں اسے برا جانے''۔ یعنی کم از کم دل میں ایک گھٹن تو محسوس کرے۔ قلب میں ایک کرب' صدمے اور رنج کی کیفیت تو ضرور پیدا ہو۔ خود تو اس سے لازماً بچے۔ آپ ﷺ نے اس آخری کیفیت کے بارے میں فرمایا: ((وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ)) ''کہ یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے''۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ اگر ان تینوں حالتوں میں سے ایک بھی

کیفیت نہیں تو ایسا شخص یہ جان لے کہ اُس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان موجود نہیں۔

چنانچہ جس شخص کی یہ کیفیت ہو کہ وہ ایمان کی دولت سے یکسر محروم ہو گیا ہو تو آخرت میں پھر وہ کہاں ہو گا؟ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ان تینوں حالتوں کا تعلق انسان کے اپنے ایمان اور یقین پر ہے۔ آپس میں دوستی اور محبت حق کی بنا پر ہونی چاہیے۔ اچھا عمل کسی دوسرے کے لیے نہ چھوڑا جائے خواہ وہ راہ سے ایک پتھر کا ہٹا دینا ہی ہو۔ مسلمان بھائی کو سلام کرنے میں پہل کریں۔ دنیا کا نقصان آخرت کے خراب ہونے سے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔ ابلیس دنیا بناتا ہے لیکن آخرت کو بگاڑتا ہے۔ نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے وقت جب اجتماعی اور مفاد عامہ کے معاملات میں طاقت کا استعمال کرنا پڑے تو ایسے معاملے کو حکمرانوں تک پہنچایا جائے۔ اُسے فتنہ و فساد اور بلوے کی شکل نہ دی جائے۔ مقصد ہر حال میں یہ ہو کہ بلوے سے بچا جائے' کیونکہ بلوے میں نقصان صرف عوام کا ہی ہوتا ہے یا نجی اور سرکاری املاک کا' رہنماؤں کی نکسیر تک نہیں پھوٹتی۔ نہی عن المنکر' قول اور فعل کی نسبت سے ایک مسنون دعا پر اپنی گزارشات کا اختتام کرتا ہوں: ''اے اللہ! میں تجھ سے جنت اور جنت سے قریب کرنے والے قول اور فعل کا طالب ہوں اور دوزخ اور دوزخ سے قریب کرنے والے قول و فعل سے پناہ مانگتا ہوں''۔

اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو' آمین! ❁❁❁

اخلاص فی العبادت اور اقامتِ دین
کی اہمیت و فرضیت، بعنوان:

توحیدِ عملی

سورۃ الزمر تا سورۃ الشوریٰ کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

اشاعت خاص 150 روپے، اشاعت عام 100 روپے

وضو کے فضائل اور آداب

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اسلام کی اخلاقی تعلیمات میں صفائی ستھرائی اور پاکیزگی کو بڑا اہم مقام حاصل ہے۔ یہ فطری طور پر ایک پسندیدہ صفت ہے جسے ''نصف الایمان'' اور ''شطر الایمان'' کہا گیا ہے۔ گویا یہ ایمان کا تکمیلی شعبہ ہے۔ ایک مومن بندے کو گندگی اور ناپاکی سے کراہت ہوتی ہے۔ فطرتِ سلیمہ صاف رہنے کا تقاضا کرتی ہے۔ اسی تقاضے کو پورا کرنے کے لیے وضو مقرر کیا گیا ہے۔ وضو سے طبیعت میں پاکیزگی کے علاوہ بشاشت اور انشراح پیدا ہو جاتی ہے۔ نماز اسلام کا اہم ترین رکن ہے جو بارگاہ الٰہی میں حضوری کا مظہر ہے۔ چنانچہ نماز کے لیے کھڑا ہونے سے قبل وضو ضروری ہے تاکہ مومن اللہ کے حضور اس حال میں پیش ہو کہ اس کا جسم صاف ستھرا ہو۔ وضو نماز کے لیے شرط ہے' یعنی وضو کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی نماز طہارت کے بغیر قبول نہیں ہوتی اور نہ کوئی صدقہ قبول ہو سکتا ہے جو ناجائز طریقہ سے حاصل کیے ہوئے مال سے کیا جائے۔'' (صحیح مسلم' عن عبداللہ بن عمرؓ)

نماز کی ادائیگی کے لیے کھڑے ہونے سے پہلے وضو کا حکم قرآن مجید میں ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَیْنِ ؕ﴾ (المائدۃ:٦)

''اے اہلِ ایمان! جب تم کھڑے ہو نماز کے لیے تو دھولیا کرو اپنے چہرے اور دونوں ہاتھ بھی کہنیوں تک اور اپنے سروں پر مسح کر لیا کرو اور (دھولیا کرو) اپنے دونوں پاؤں بھی ٹخنوں تک۔''

گویا وضو کرتے وقت منہ ہاتھ اور پاؤں دھونا اور سر کا مسح کرنا فرض ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جنت کی کنجی نماز ہے اور نماز کی کنجی طہور (یعنی وضو) ہے''۔ (مسند احمد عن جابرؓ) ویسے تو ہر کام اچھی طرح کرنا چاہیے' وضو بھی اچھی طرح کرنا چاہیے جو گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص وضو کرے اور خوب اچھی طرح وضو کرے تو اس کی خطائیں اس کے جسم سے نکل جاتی ہیں' حتیٰ کہ اس کے ناخنوں کے نیچے سے بھی نکل جاتی

ہیں''۔ (متفق علیہ عن عثمانؓ)

اسی ضمن میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''جب کوئی بندہ وضو کرتا ہے اور اس میں اپنے چہرے کو دھوتا ہے اور اس پر پانی ڈالتا ہے تو پانی کے ساتھ اس کے چہرے سے وہ سارے گناہ نکل جاتے ہیں جو اس کی آنکھوں سے سرزد ہوئے تھے۔ اس کے بعد جب وہ اپنے ہاتھ دھوتا ہے تو وہ سارے گناہ اس کے ہاتھوں سے خارج ہو جاتے ہیں اور دھل جاتے ہیں جو اس کے ہاتھوں سے ہوئے۔ اس کے بعد جب وہ اپنے پاؤں دھوتا ہے تو وہ سارے گناہ اس کے پاؤں سے خارج ہو جاتے ہیں جو اس کے پاؤں سے ہوئے اور جن کے لیے اس کے پاؤں استعمال ہوئے۔ یہاں تک کہ وضو سے فارغ ہونے کے ساتھ وہ گناہوں سے پاک صاف ہو جاتا ہے''۔ (صحیح مسلم عن ابی ہریرہؓ) پانی کے ساتھ اعضاء دھونے سے ظاہری میل کچیل دور ہو جاتی ہے۔ چونکہ وضو کرنا اللہ تعالیٰ کا حکم اور رسول اللہ ﷺ کا طریقہ ہے' لہٰذا یہ صرف بدن کو صاف نہیں کرتا بلکہ اس کی برکت سے روحانی مفاد بھی ملتا ہے اور وضو کے اثر سے اعضاء بھلائی کی طرف مائل ہوتے ہیں اور برائی سے اجتناب کرتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ وضو وہی کرے گا جس کو نماز پڑھنا ہوگی' بے نمازی تو ان ساری بھلائیوں سے محروم رہے گا۔ بے نمازی کی یہ ایک محرومی ہے اس کے علاوہ وہ دوسرے کئی اعتبارات سے منحوس ٹھہرے گا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو کوئی تم میں سے وضو کرے اور مکمل وضو کرے' پھر وضو کے بعد کہے ''اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ'' تو لازمی طور پر اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھل جائیں گے' وہ جس دروازے سے چاہے گا جنت میں جا سکے گا''۔ (صحیح مسلم عن عمرؓ بن الخطاب) اس سے پہلے رسول اللہ ﷺ کا فرمان نقل ہو چکا کہ جنت کی کنجی نماز ہے اور نماز کی کنجی طہور یعنی وضو ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ اس حدیث سے مکمل وضو کر کے بعد میں کلمۂ شہادت ادا کرنے والے کو بھی جنت میں داخلے کی بشارت ہے۔ ایک شخص نے آپ ﷺ سے پوچھا: ''آپؐ روزِ محشر اپنی امت کو کیسے پہچانیں گے جبکہ نوح علیہ السلام سے لے کر آپؐ کی امت تک کئی امتیں ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''وضو کے نشانات کی وجہ سے۔ ان کے ہاتھ' پاؤں اور پیشانی چمکتی ہوگی' ان کے علاوہ اور کوئی ایسا نہیں ہوگا۔ میں انہیں اس لیے بھی پہچان لوں گا کہ انہیں ان کا نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ اور میں انہیں ایک اور علامت سے بھی پہچان لوں گا کہ ان کی اولاد ان کے آگے دوڑ رہی ہوگی۔'' (رواہ احمد عن ابی الدرداء)

وضو جہاں دنیاوی زندگی میں پاکی اور ستھرائی کا باعث ہے قیامت کے دن وہ نورانیت کا باعث ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میرے امتی قیامت کے دن بلائے جائیں گے تو وضو کے اثرات سے ان کے چہرے اور ہاتھ اور پاؤں روشن اور منور ہوں گے' پس تم میں سے جو کوئی اپنی روشنی اور نورانیت بڑھا سکے اور مکمل کر سکے تو ایسا ضرور کرے''۔ (متفق علیہ عن ابی ہریرہؓ)

مکمل اور پورا وضو وہ ہے جس میں ہر عضو کو تین مرتبہ دھویا جائے۔ اس کے بعد وہ وضو ہے جس میں اعضاء، دو دو مرتبہ دھوئے جائیں' اور وہ تو محض وضو ہے جس میں ہر عضو ایک ہی مرتبہ دھویا جائے۔ پسندیدہ یہ ہے کہ وضو اطمینان اور سکون کے ساتھ کیا جائے اور ہر عضو کو تین بار دھویا جائے۔ جلدی میں ناقص وضو سے احتراز کرنا چاہیے۔ اصحابِ رسول ﷺ میں سے ایک صاحب سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے نماز فجر ادا کی تو سورۃ الروم کی تلاوت فرمائی جس کے دوران آپؐ بھول گئے۔ جب آپؐ نماز پڑھ چکے تو فرمایا: ''لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ نماز پڑھتے ہیں لیکن وہ اچھی طرح وضو نہیں کرتے۔ یہی لوگ تو ہمیں قرآن بھلا دیتے ہیں''۔ (رواہ النسائی عن شبیب بن ابی روحؒ)

معلوم ہوا کہ ناقص وضو نتیجے کے اعتبار سے کیسا ہے۔ یہ وہ وضو ہے جسے سنجیدگی اور دھیان کے ساتھ نہ کیا گیا ہو' کیونکہ مکمل وضو کے بغیر تو نماز ہی نہیں ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو مسلمان وضو کرتا ہے اور اپنا وضو اچھی طرح کرتا ہے' پھر کھڑا ہو کر مکمل توجہ کے ساتھ دو رکعتیں پڑھتا ہے تو اس کے لیے جنت واجب ہو جاتی ہے''۔ (صحیح مسلم عن عقبہ بن عامرؓ)

چونکہ وضو نماز کے لیے لازم ہے اس لیے نماز کو احسن بنانے کے لیے وضو بھی احسن ہونا چاہیے۔ نماز کے لیے حکم ہے کہ پورے دھیان سے خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کی جائے۔ اسی طرح بار بار اس بات کی بھی تاکید کی گئی ہے کہ وضو اچھے طریقے سے کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب کوئی مسلمان فرض نماز کا وقت ہونے پر اس کے لیے اچھی طرح وضو کرتا ہے اور اس کے خشوع اور رکوع کا اچھی طرح اہتمام کرتا ہے تو وہ (نماز) اس سے پہلے کیے ہوئے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے' بشرطیکہ کبیرہ گناہوں کا ارتکاب نہ کیا ہو۔ یہ ہمیشہ کے لیے ہے''۔ (صحیح مسلم عن عثمانؓ) وضو قیامت کے دن مؤمن کے لیے عزت افزائی کا باعث ہوگا۔ اس کے وضو کے اعضاء روشن ہوں گے اور اسے زیور پہنایا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مومن کا زیور وہاں تک ہوگا جہاں تک اس کے وضو کا پانی پہنچتا ہے''۔ (صحیح مسلم عن ابی ہریرہؓ)

وضو میں پانی کے ساتھ اعضاء دھوئے جاتے ہیں۔ گرمیوں میں وضو کریں تو خنکی کا تصور

ہوتا ہے مگر سردی کے موسم میں ٹھنڈا پانی ناگوار اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ لیکن اس مشکل کو برداشت کرنا نتیجے کے اعتبار سے خوش گوار ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا میں تم کو وہ اعمال نہ بتاؤں جن کی برکت سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو مٹاتا ہے اور درجے بلند فرماتا ہے؟ حاضرین نے عرض کیا: حضورؐ ضرور بتائیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (۱) تکلیف اور ناگواری کے باوجود پوری طرح کامل وضو کرنا۔ (۲) مسجدوں کی طرف زیادہ قدم چلنا۔ (۳) ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا منتظر رہنا۔ پس یہی ہے حقیقی رباط''۔ (صحیح مسلم عن ابی ہریرہؓ)۔ رباط سے مراد ہے شیطان کی غارت گری سے حفاظت کی محکم تدبیر۔

وضو کی حالت میں انسان صاف ستھرا اور پاک ہوتا ہے۔ یہ اچھی حالت اکثر قائم رہنی چاہیے۔ بعض متقی اور خدا ترس لوگوں کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اکثر باوضو رہتے تھے۔ اکثر اوقات باوضو رہنا بڑا فضیلت کا عمل ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ''جو شخص رات کو باوضو سوتا ہے تو ایک فرشتہ ساری رات اس سے جڑا رہتا ہے اور اس کے لیے ان کلمات سے استغفار کرتا ہے: اے اللہ اپنے فلاں بندے کی مغفرت کر دے کہ وہ رات کو باوضو سویا ہے''۔ (صحیح مسلم' بحوالہ بکھرے موتی ص ۵۶' از مولانا محمد یونس پالن پوری)

اگر پہلے سے وضو قائم ہو اور نماز کا وقت آ جائے تو اسی وضو کے ساتھ نماز پڑھی جا سکتی ہے' لیکن اگر پھر وضو کر لیا جائے تو پسندیدہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے طہارت یعنی وضو کے باوجود تازہ وضو کیا اس کے لیے دس نیکیاں لکھی جائیں گی''۔ (ترمذی عن عبداللہ بن عمرؓ)

رسول اللہ ﷺ کو طہارت اور نظافت بہت پسند تھی۔ آپؐ نے مسواک کے ساتھ منہ کو صاف رکھنے کی بڑی تاکید کی ہے' لہٰذا وضو کرتے وقت مسواک بھی کرنی چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ نماز جس کے لیے مسواک کی جائے اس نماز کے مقابلہ میں جو بلا مسواک پڑھی جائے ستر گنا فضیلت رکھتی ہے''۔ (بیہقی فی شعب الایمان)

مسواک بذاتہٖ نہایت مفید اور پسندیدہ عمل ہے جسے رسول اللہ ﷺ محبوب جانتے تھے۔ لیکن آپؐ نے وضو کے وقت مسواک کرنے کا حکم نہیں دیا' کیونکہ اس سے وضو کرنے والے پر مشقت پڑتی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ میری امت پر بہت مشقت پڑ جائے گی تو میں ان کو ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا پختہ حکم کرتا''۔ (صحیحین عن ابی ہریرہؓ) یہ امر آپ ﷺ

کی نرمی کا مظہر ہے۔ یہ ویسا ہی ہے جیسا آپ ﷺ نے عام راتوں میں تہجد اور رمضان المبارک میں قیام اللیل کی بڑی فضیلت بتائی مگر اس کو ہر شخص کے لیے لازمی قرار نہیں دیا۔

مسواک کی فضیلت بتاتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا: ''مسواک منہ کو بہت زیادہ پاک صاف کرنے والی اور اللہ تعالیٰ کو بہت خوش کرنے والی چیز ہے''۔ (صحیح بخاری عن عائشہؓ) یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو مسواک بہت پسند تھی۔ آپؐ کا معمول تھا کہ دن یا رات میں جب بھی آپؐ سوتے تو اٹھنے کے بعد وضو کرنے سے پہلے مسواک ضرور فرماتے۔ اسی طرح جب آپؐ رات کو تہجد کے لیے اٹھتے تو مسواک سے اپنے دہن مبارک کی خوب صفائی کرتے۔ روایات اس بات پر شاہد ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب باہر سے گھر تشریف لاتے تو سب سے پہلے آپؐ مسواک فرماتے تھے۔ غرض مسواک وضو کا حصہ نہ سہی مگر یہ منہ کی بو زائل کرتی ہے' دانتوں کی حفاظت کرتی ہے اور آخرت میں بڑے اجر کا باعث ہوگی۔

ویسے تو ہر جائز اور نیک کام کی ابتدا بسم اللہ سے کرنی چاہیے' مگر وضو کرتے وقت اس کی خصوصی تاکید ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے اللہ کا نام لیے بغیر وضو کیا' اُس کا وضو ہی نہیں''۔ (جامع ترمذی عن سعید بن زیدؓ) اللہ کا نام لیے بغیر جو وضو کیا جائے اگرچہ وہ بالکل بیکار نہیں ہے لیکن اپنی باطنی تاثیر اور نورانیت کے لحاظ سے بہت ناقص ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص وضو کرے اور اس میں اللہ کا نام لے تو یہ وضو اس کے سارے جسم کو پاک کر دیتا ہے اور جو کوئی وضو کرے اور اس میں اللہ کا نام نہ لے تو وہ وضو اس کے صرف اعضائے وضو ہی کو پاک کرتا ہے''۔ (سنن دار قطنی عن عبداللہ بن عمرؓ)

وضو کرنے کے بعد جسم کے گیلے حصوں کو کپڑے سے پونچھ لینا بھی سنت سے ثابت ہے۔ اس کے لیے تولیہ یا کوئی اور کپڑا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ وضو کے بعد کلمہ شہادت اور یہ دعاء ماثور پڑھنا فضیلت اور برکت کا باعث ہے: اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ التَّوَّابِیْنَ وَاجْعَلْنِیْ مِنَ الْمُتَطَھِّرِیْنَ۔

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

قرآن حکیم کی عظمت' تعارف اور حقوق و مطالبات
جیسے علمی و عملی موضوعات پر 8 کتابوں کا مجموعہ

قرآن حکیم اور ہم

از ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ تقریباً 500 صفحات پر مشتمل فکر انگیز تالیف

خود پڑھیں۔ دوسروں کو تحفہ میں دیجیے!

اشاعت خاص (مجلد):
امپورٹڈ آفسٹ پیپر، قیمت: 450 روپے

اشاعت عام (پیپر بیک):
امپورٹڈ بک پیپر، قیمت: 300 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور فون: 3-35869501-042

maktaba@tanzeem.org

سقوطِ خلافت سے دورِ حاضر تک

بسلسلہ "نظامِ خلافت : کیا؟ کیوں ؟ کیسے؟"(۵)

شجاع الدین شیخ☆

آج ہمارا عنوان ہے ''سقوطِ خلافت سے دورِ حاضر تک''۔ آج ہم ان شاء اللہ چھ باتیں سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ سب سے پہلے یہ کہ جب ۱۹۲۴ء میں سقوطِ خلافت کا معاملہ ہوا اور مسلمانوں کی مرکزیت بالکل پاش پاش ہوگئی تو اس کے اثرات کیا ہوئے' اس کے کیا نقصانات ہم بھگتتے چلے آرہے ہیں؟ دوسری بات یہ کہ سقوطِ خلافت کے بعد کیا مسلم امہ میں اس کے احیاء کی کوششیں ہوئی ہیں؟ اس کے تاریک پہلو کو بہت اختصار کے ساتھ بیان کریں گے اور وہ یہ کہ مسلم سربراہانِ مملکت کی سطح پر اگر کچھ ہوا تو وہ کیا تھا؟ تیسری بات یہ کہ چند مسلم ممالک میں سقوطِ خلافت کے بعد کیا کوششیں ہوئیں' ان کا ہم مختصراً جائزہ لیں گے جس میں پاکستان کا بھی ذکر آئے گا۔ چوتھی بات یہ کہ مختلف ممالک میں جو احیائی تحریکیں چلتی رہیں ان میں کوئی خاطر خواہ کامیابی دکھائی نہیں دیتی۔ اس ضمن میں وہ کیا مشترک نکات ہیں جن پر توجہ کی ضرورت ہے۔ پانچویں بات یہ کہ اس وقت ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ہماری موجودہ صورتحال کیا ہے؟ اگرچہ ان کا اشارہ درمیان کے نکات میں بھی آجائے گا۔ چھٹی اور آخری بات یہ کہ آنے والے دور کی جو تصویر ہمیں احادیث مبارکہ میں ملتی ہے اور جن کو پڑھ کر ایک امنگ پیدا ہوتی ہے' روشنی کی کرن دکھائی دیتی ہے' ان احادیث کا ہم آج مطالعہ کریں تاکہ مستقبل کی تصویر کی جھلک تو ہمارے سامنے ہو اور اسے سامنے رکھتے ہوئے ہم اپنے اندر نظامِ خلافت کے قیام کی جِدّوجُہد کے لیے جذبہ بیدار کرسکیں۔

سقوطِ خلافت کے نقصانات

سب سے پہلے ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ سقوطِ خلافت کے نتیجے میں امت کو کن نقصانات کا سامنا ہے۔ میں اس ضمن میں آپ کے سامنے نو نکات پیش کروں گا۔

(۱) مسلمانوں کی مرکزیت ختم ہوگئی۔ اس خطے کے مسلمان کو اگر عراق جانا ہو تو ویزے کا مسئلہ پیش

☆ امیر تنظیم اسلامی حلقہ کراچی شمالی

نہیں آتا تھا۔ آج ہمیں یہ مسئلہ درپیش ہے۔ ہم سب مختلف سرحدی لکیروں میں تقسیم ہو چکے ہیں۔ اس سے قبل کفریہ طاقتوں کو ہم پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہیں ہوتی تھی جیسی کہ آج ہے' کہ جب چاہو عراق کی اینٹ سے اینٹ بجادو' افغانستان پر حملہ آور ہو جاؤ' بوسنیا میں نسل کشی کردو' مشرقی تیمور میں تباہی مچادو۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کی روشنی میں آنکھ بھی تکلیف محسوس کرتی تو پورا جسم تکلیف محسوس کرتا تھا۔ آج ایسا نہیں ہے۔ لیکن ۱۹۰۱ء میں جبکہ خلافت قائم تھی' خلیفہ عبدالحمید ثانی کے سامنے صہیونی تحریک کے سربراہ ڈاکٹر ہرڈل نے پیشکش کی کہ فلسطین کا کچھ حصہ ہمیں دے دو اور ایک خطیر رقم لے لو۔ آج ہمیں کہا جاتا ہے کہ اگر ریمنڈ ڈیوس کو نہیں چھوڑا تو تمہاری امداد روک دی جائے گی۔ یہ رشوت ۱۹۰۱ء میں بھی دی گئی۔ یہ پیشکش اس لیے کی گئی تھی کہ اسرائیل کی ریاست قائم ہوسکے' جو ۱۹۴۸ء میں قائم ہوئی۔ اس کے جواب میں خلیفہ کے الفاظ تھے کہ میں فلسطین کی زمین کا بالشت بھر حصہ بھی کسی کے حوالے نہیں کرسکتا' کیونکہ یہ میری ذاتی زمین نہیں ہے جسے میں قربان کردوں۔ فلسطین کی زمین مسلم اُمہ کی ملکیت ہے' ہمارے لوگوں نے اس کے لیے سخت جنگیں لڑی ہیں اور اسے اپنے خون سے سینچا ہے' میں اپنی زندگی میں اپنی جسموں کے ٹکڑے کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ ہم ۱۹۰۱ء میں یہ کہہ سکتے تھے' لیکن آج ہم یہ نہیں کہہ سکتے۔ آج تو ہم کہتے ہیں کہ ہماری سرزمین سے ۵۷ ہزار پروازیں اڑالو۔ ایک فون امریکہ سے آیا تو مشرف نے کہا:

Yes we are with you,we are not with Allah, Mohammad S.A.W.S, Muslim ummah, Afghan Muslims.

یہاں سے پروازیں اڑاؤ' جاکر ڈیزی کٹر بم مارو۔ یہ فرق ہے ۱۹۰۱ء اور ۱۱۔۲۰۱۰ء میں۔ ہماری مرکزیت ختم ہوچکی ہے۔ ہم تتر بتر ہوئے پڑے ہیں۔ یہ ظالم استعماری قوتیں جب چاہتی ہیں ہم پر حملے کرتی ہیں اور کرتی رہیں گی۔

(۲) جب کبھی ہمیں ان استعماری قوتوں سے آزادی ملی بھی تو یہ جاتے جاتے اپنے ایجنٹس ہمارے اندر چھوڑ گئے۔ انہی کے پروردہ' نوازے ہوئے لوگ' آج کے یہ بڑے بڑے جاگیردار وں کے بڑوں کو انگریزوں نے سر کے خطابات دیے تھے' ان کو بڑی بڑی جاگیریں دی تھیں۔ اب وہ ان کے ذریعے سے اپنے مقاصد کی تکمیل کرواتے ہیں۔ چاہے وہ مصر کا حسنی مبارک ہو یا ہمارے ہاں کا پرویز مشرف' یا اس سے پہلے کے ادوار کے لوگ تھے۔

(۳) عسکری' سیاسی' معاشی اور نظریاتی حتیٰ کہ تعلیمی سطح پر نصاب کے ذریعے ہمیں غلام در غلام در غلام بنا چھوڑا گیا ہے۔ ہمارے جسم آزاد ہوئے' فکر سوچ' نظام تعلیم آزاد نہیں ہے۔ اب تو ان کی ڈیمانڈز آتی ہیں۔ بڑے بڑے پیشہ ورانہ اداروں میں 'اسلامک اسٹڈیز' کا نام تبدیل کرکے اسے Ethics کا نام دے دیا گیا ہے۔ کس کے Ethics؟ اللہ کے یا انسانوں کے؟ یا جانوروں اور

جانوروں کی سطح پر زندگی بسر کرنے والے انسانوں کے Ethics؟ یا پھر اسے 'سوشل اسٹڈیز' کہہ دیا گیا۔ دو تین پرائیویٹ یونیورسٹیز میں جب گفتگو کا موقع ملا تو انہوں نے اپنا کورس بتایا کہ ۵۰ مارکس اسلامک اسٹڈیز' ۵۰ مارکس پاکستان اسٹڈیز' جبکہ دیگر مضامین ۱۰۰' ۱۰۰ مارکس کے۔ جب اوّل الذکر مضامین کا کورس دیکھا گیا تو تین تین گھنٹے کے ۱۵ اسیشنز (۴۵ گھنٹے) پر مشتمل پایا۔ ۴۵ گھنٹوں میں سے ایک امتحانات کے لیے اور ایک طلبہ کے پریزنٹیشن کے لیے نکال دیں' باقی ۱۳ بچے' یعنی کُل ۳۶ گھنٹے۔ ۱۳ میں سے ۱۱ مضامین پاکستان اسٹڈیز کے جبکہ صرف دو اسلامک اسٹڈیز کے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ یہ تکلف کیوں کرتے ہیں' اسلامک اسٹڈیز نہ پڑھائیں!

اب ذرا آگے بڑھیں۔ اگر سورۃ التوبہ میٹرک کے نصاب میں شامل ہو جائے تو مغرب کو ٹینشن ہو جاتی ہے' کیونکہ اس میں جہاد اور قتال کا تذکرہ آتا ہے۔ مغرب کو تو اُس وقت بھی تکلیف ہوئی جب نائن الیون کے آس پاس قنوتِ نازلہ شروع ہوئی۔ جب امت کو کوئی بڑی تکلیف پہنچتی ہے تو فجر کی نماز میں قنوتِ نازلہ پڑھی جاتی ہے: ''اے اللہ! ان کی جمعیت کو متفرق کر دے..... ان کے گھروں کو برباد کر دے' ان کی بنیادوں کو اکھیڑ دے.....!'' اس قنوتِ نازلہ کا ترجمہ مغربی میڈیا میں انگریزی زبان میں شائع ہوا تو اللہ اور اسلام کے نہ ماننے والوں کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ اگر مسلمانوں کی یہ دعائیں قبول ہو گئیں تو ہم مصیبت میں پڑ جائیں گے۔ انہوں نے مسلم حکمرانوں کو لکھ بھیجا کہ اپنے ہاں ان دعاؤں کو ختم کرواؤ۔ چنانچہ پاکستان میں محکمہ اوقاف کی مساجد میں قنوتِ نازلہ کے پڑھنے پر پابندی کا حکم جاری ہو گیا۔ یہ ریکارڈ پر موجود ہے۔ یہ غلامی در غلامی کی انتہا کا معاملہ ہے کہ فکر و سوچ' نصابِ تعلیم اور مسجدیں بھی آزاد نہیں۔ برطانوی وزیراعظم آ جائے تو شاہ فیصل مسجد میں اذان نہ ہو۔

(۴) جب ہماری خلافت اور اس کے نتیجے میں ہماری مرکزیت ختم ہوئی' جسم اور سوچیں تو گئیں' ایمان سے بھی کھلواڑ شروع کیا گیا۔ جب خلافت تھی تو جواب کیا تھا اور جب خلافت نہیں ہے تو جواب کیا ہے' آیئے اس کا جائزہ لیں۔ خلیفہ عبدالحمید ثانی' جس نے ۱۹۰۱ء میں فلسطین کے حوالے سے پیشکش کو ٹھکرایا تھا' کے دور میں فرانس میں والٹر کے کچھ اسکرپٹس کی بنیاد پر کچھ اسٹیج شوز ہونے تھے جس میں نبی اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی تھی۔ خلیفہ نے فرانس کے سفیر کو بلایا اور کافی دیر تک اس کو انتظار کروایا۔ (جیسے اب ہمارے حکمران کہیں جاتے ہیں تو ان کو انتظار کروایا جاتا ہے۔ ان کو ریڈ کارپٹ ٹریٹمنٹ نہیں ملتا' بلکہ کتوں سے ان کے سامان کی تلاشی بھی لی جاتی ہے۔) اس کے بعد خلیفہ پورا جنگی لباس زیب تن کر کے شمشیر بدست آیا۔ اُس نے تلوار دکھائی اور اپنا پیغام دے دیا۔ سفیر نے اپنی حکومت کو اطلاع کر دی کہ اگر یہ اسٹیج شوز نہ رکوائے گئے تو یہ جنگ کریں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اسٹیج شوز روک دیے گئے جن کی ٹکٹیں فروخت ہو چکی تھی۔ خلیفہ نے حکومت فرانس کو واضح طور

پر لکھ بھیجا تھا کہ اگر یہ اسٹیج شوز نہ رکے تو میں پوری امت میں فتویٰ جاری کر دوں گا کہ یہ ہمارے رسول ﷺ کی شان میں گستاخی کے مرتکب ہیں اور میں تمہارے خلاف جہاد کا اعلان کر دوں گا۔ یہ اُس وقت ہوا جب رہی سہی خلافت باقی تھی۔ آج ہمارے جلسے جلوسوں اور احتجاجی مظاہروں سے وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ کبھی حضور ﷺ کے توہین آمیز خاکے بنائے جاتے ہیں' کبھی قرآن جلا کر اس کی بے حرمتی کی جاتی ہے۔ اس لیے کہ انہیں پتا ہے کہ ہم میں اتحاد نہیں ہے۔ یہ فرق ہے خلافت ہونے اور نہ ہونے میں۔

(۵) پانچویں بات بڑی عجیب ہے۔ جب مصطفیٰ کمال پاشا نے ۱۹۲۴ء میں خلافت کے خاتمے اور ترکی کو ایک سیکولر ریاست بنانے کا اعلان کر دیا تو برطانوی سکریٹری خارجہ نے برطانوی پارلیمنٹ میں یہ بات بڑے فخر سے کہی کہ حقیقت یہ ہے کہ ترکی تباہ ہو چکا ہے' اب یہ دوبارہ اٹھ نہیں سکے گا' کیونکہ ہم نے اس کی روحانی قوت یعنی اسلام اور خلافت کو تباہ کر دیا ہے۔ ہم سے زیادہ انہوں نے ہمیں پڑھا ہے۔ چرچل نے کبھی اپنے لوگوں کے سامنے قرآن ہاتھ میں لے کر کہا تھا کہ اگر اس قوم کو قابو میں لانا ہے تو اسے قرآن سے روکنا پڑے گا۔ اگر انہیں قرآن سے نہیں روکو گے تو یہ بڑھتے چلے جائیں گے اور ہم پر قابض ہو جائیں گے۔ برناڈ شا نے کہا تھا کہ مانو یا نہ مانو آئندہ آنے والی ایک صدی میں برطانیہ کا سیاسی نظام یا تو اسلام ہو گا یا اس سے قریب تر کوئی شے ہو گی۔ ہم سے زیادہ سیرت کا مطالعہ غیر مسلموں نے کیا ہے۔ مائیکل ہارٹ ایک سو عظیم ترین ہستیوں کا تجزیہ کرنے کے بعد سرفہرست محمد ﷺ کو لاتا ہے۔ اُس نے یقیناً سیرت کا بغائر مطالعہ کیا ہو گا' جب ہی تو وہ اس نتیجے پر پہنچا۔ کیا ہم مسلمان سیرت کا مطالعہ کرتے ہیں؟ ان غیر مسلموں کے خراج تحسین کی رسول اللہ ﷺ کو کوئی ضرورت نہیں' البتہ ہم اس سے متاثر ہو جاتے ہیں کہ نپولین' شیکسپیئر' نپولین اور برناڈ شا نے یہ کہہ دیا' گاندھی نے یہ لکھ دیا۔ ان سب کا انجام کفر پر ہوا' آخرت میں ان کو کوئی فائدہ نہیں ملنا۔ بہرحال ہم خلافت کے ماننے والے اس کو اتنا نہیں جانتے جتنا اس کے مخالفین جانتے ہیں۔

(۶) اب آتے ہیں چھٹی بات کی طرف اور وہ ہمارے معدنی وسائل پر اغیار کا قبضہ ہے۔ خلافت کے خاتمے کے بعد مسائل پیدا ہونے شروع ہو گئے اور ان کے اثرات آج ہمارے سامنے ہیں۔ بلوچستان میں علیحدگی کی تحریک کی پشت پر یہی اغیار ہیں اور ان کی نظر ہمارے معدنی وسائل پر ہے۔ افغانستان میں فقط طالبان حکومت ہی کا معاملہ نہیں تھا' وہاں جو معدنیات موجود ہیں انہیں پوری دنیا جانتی ہے۔ ان کی بڑی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں نے اربوں کی انوسٹمنٹ کر دی' تب امریکہ نے افغانستان پر حملے کا رِسک لیا۔ اب ہوش ٹھکانے آ گئے' اس لیے کہ طالبانِ افغانستان کے پاس ایمان کی قوت ہے۔ لیکن اس تناظر میں دیکھیں تو ان کی نگاہیں ہمارے معدنی وسائل پر ہیں۔ آج بھی عرب دنیا کے پاس جو تیل

ہے وہ مغربی ممالک کے ذخائر سے اٹھارہ گنا زیادہ ہے۔ امریکہ نے اپنے exploded reserves کو استعمال نہیں کیا ہے۔ وہ معدنی دولت پر قبضے کے لیے ۱۹۹۱ء میں خلیج کی جنگ میں داخل ہوا۔ اس کے بیسز بحرین میں بھی ہیں اور حرمین شریفین کے قریب بھی موجود ہیں۔ وہ عالمِ اسلام کا تیل استعمال کر رہا ہے۔ آج تیل کی قیمتیں اس کی اشیر باد سے طے ہوتی ہیں اور اُسی کی نگرانی میں دنیا میں تیل کی ترسیل ہوتی ہے۔ ورنہ وہ بحری راستے بند کر دیں تو مسلم ممالک میں، بشمول پاکستان تیل ہی نہ پہنچ سکے۔ ہماری مرکزیت ختم ہوگئی اور اب یہ دنیا کے تھانے دار بن گئے ہیں۔

(۷) یہ بات میں نے پہلے بھی عرض کی تھی کہ اسلامی نظام کا تعطل ہو چکا ہے۔ اس کے بارے میں دو الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں جن کو صاف کر لینے کی ضرورت ہے۔ ایک کا تذکرہ پہلے ہو چکا، ایک آج کر رہا ہوں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ۱۹۲۴ء میں ترکی میں خلافت ختم ہوئی اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اب تک جتنا دور بھی مسلمانوں کا گزرا وہ سارا آئیڈیل دور تھا۔ آئیڈیل ترین دور تو خلافت راشدہ تھا۔ اس کے بعد بگاڑ پیدا ہونا شروع ہوا۔ بدترین بگاڑ بھی آئے۔ اس کے باوجود سقوطِ خلافت سے قبل تک ایک عام مسلمان عدالت سے شرعی فیصلہ لینا چاہتا تو ایسا ممکن تھا، شریعت کے فیصلے کی تعمیل کرانا چاہتا تو کرا سکتا تھا۔ بڑے بڑے باغی خلفاء بھی تھے، مگر عدالتوں میں شرعی قوانین موجود تھے اور ان کا نفاذ بھی ہوتا تھا۔ یقیناً خلافت راشدہ کے بعد زوال ہے، لیکن یہ معاملہ کہ ہم ۵۶ ٹکڑوں میں بٹ چکے ہوں، ہماری مرکزیت ختم ہو چکی ہو، ایسا نہیں ہوا تھا۔

جب ہم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی گفتگو سنتے ہیں یا مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو پڑھتے ہیں یا علامہ اقبال کا انقلابی پیغام ہمارے سامنے آتا ہے یا ابوالکلام آزادؒ کی انقلابی گفتگو سنتے ہیں اور نظامِ خلافت کی فرضیت کی بات ہمارے سامنے آتی ہے تو ایک عام مذہبی طبقے میں کبھی کبھی ایک الجھن پیدا ہوتی ہے کہ یہ بات کہاں سے آ گئی؟ اَسلاف میں تو یہ بات نہیں ملتی۔ یہ الجھن بھی ہم نے شروع میں دُور کی تھی کہ جس کو ہم قرآنی اصطلاح میں 'اقامتِ دین' کہتے ہیں، فقہاء اسے 'نصبِ امامت' کہتے ہیں۔ یہ دلائل آپ کے سامنے پیش کیے گئے تھے، خواہ وہ امام ماوردیؒ کے اقوال ہوں یا شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی بات ہو یا امام ابن تیمیہؒ کے اقتباسات ہوں۔ خلافت کے خاتمہ سے قبل دین میں جہاں جہاں دراڑیں پڑتی نظر آتی تھی تو مجتہدینِ امت کھڑے ہو جاتے تھے اور ان کی اصلاح کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن سقوطِ خلافت کے بعد احیائی تحریکوں نے خلافت کے احیاء کی ضرورت کو محسوس کیا اور انہوں نے اس کے لیے کام کرنا شروع کیا۔ مصر میں الاخوان المسلمون، برصغیر میں تحریک خلافت، پھر جماعتِ اسلامی اور بہت سے دیگر مسلم ممالک میں کوششیں شروع ہوئیں۔ یہ دو وضاحتیں ضروری تھیں۔

اسلامی نظام کا تعطل بایں معنیٰ ہے کہ یہ صفحۂ قرطاس پر تو ہے لیکن کہیں نافذ نہیں ہے۔ لوگوں کی انفرادی زندگیوں میں کچھ کچھ شریعت کی تعلیمات موجود ہیں، لیکن اجتماعی سطح پر اس کا کوئی وجود نہیں۔ پھر نتیجہ یہ نکلا کہ جب اسلامی شریعت کے احکامات کا اجتماعی سطح پر کوئی نفاذ نہیں ہوا تو اگلی نسل میں اسلام کے ایک مکمل ضابطۂ حیات ہونے کا تصور ہی ختم ہو گیا۔

(۸) اسی کے تسلسل میں آٹھواں نکتہ یہ کہ جب ہماری اجتماعی مرکزیت ختم ہوئی، ہمارا نظام ختم ہوا اور امت ٹکڑوں میں بٹ گئی، غیروں کو ہم پر حملہ آور ہونے کا موقع ملا تو غیروں کی اَقدار بھی ہمارے ہاں درآمد ہونا شروع ہو گئیں۔ حد تو یہ ہوئی کہ ان کا طرزِ زندگی، رسومات، ان کا معیارِ زندگی وغیرہ بھی مسلم ممالک میں درآمد ہوئے۔ آج بڑے بولڈ انداز میں ایک مسلمان نوجوان اپنے بڑوں سے کہتا ہے کیا ہو گیا اگر ہم نے ویلنٹائن ڈے منا لیا؟ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اسی برصغیر میں برقعے اور نقاب کے بغیر اگر کوئی عورت نکلتی تو اُسے بے حیا، بے شرم کہا جاتا تھا۔ آج نبی اکرم ﷺ کی یہ روحانی بیٹیاں اور بیٹے ویلنٹائن ڈے مناتے ہیں، باہم محبتوں کا اظہار ہو رہا ہے۔ اس کو ترقی کہا جا رہا ہے، جدید دور کا تقاضا گردانا جا رہا ہے۔ سوائے ایک دو چینلز کے سارا الیکٹرانک میڈیا سرخ ہو رہا تھا، محبتوں کے پیغام عام کیے جا رہے تھے۔ اہلِ ایمان کی شدید ترین محبت تو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ سے ہوتی ہے۔ اپنے والدین سے سال کے ۳۶۵ دن محبت کرو۔ اپنے ماں باپ کو محبت سے دیکھو، ایک حج کا ثواب ملے گا، نامحرم عورت کو دیکھو گے تو گناہ ہوگا۔ مغرب سے اس قدر چیزیں درآمد ہو گئیں، مادرز ڈے، فادرز ڈے، ہیلوئنگ، ڈریس کوڈ، ہر جگہ اقدار کا بیڑا غرق ہو رہا ہے۔ سقوطِ خلافت سے قبل اس طرح کی چیزوں کی دخل اندازی کا موقع نہیں تھا۔

(۹) اس ضمن میں آخری بات یہ کہ اب اسلامی تعلیمات کا ریفرنس موجود نہیں، البتہ باطل نظاموں کا ریفرنس موجود ہے۔ مغرب سے مرعوبیت اس قدر ہے کہ باطل نظام کو اسلام کی پیوند کاری کر کے مسلم معاشروں میں پیش کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ کہیں آمریت اور کہیں نام نہاد جمہوریت ہے۔ یہ مادر پدر آزاد جمہوریت مغرب سے آئی، جس میں برٹش پارلیمنٹ کا ایک ممبر ہم جنس پرستی کی گندگی میں مبتلا ہوا تو بجائے اس کے کہ اس کی مذمت کی جاتی اور اس کا ٹرائل ہوتا، کہا گیا کہ یہ سارے عوام کے نمائندے ہیں لہٰذا ان کی جانب سے بل پاس کر دو اور تالیوں کی گونج میں ہم جنس پرستی کا بل سب سے پہلے برطانیہ میں پاس ہوا۔ اب پوری قوم کے دو مرد یا دو عورتیں آپس میں شادی کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد اب یہ مغرب کے اکثر ممالک میں جائز اور قانونی قرار دیا جا چکا ہے۔ وہاں ریفرنس انسانی عقل کا ہے، الہامی قانون کا نہیں ہے۔ اب ہمارے ہاں بھی بعض دانشور حضرات اور مفکّرین جمہوریت کے لیے دلائل قرآن وسنت سے دیتے ہیں۔ اسلام کی شورائیت کے

مزاج کو یہ جمہوریت گردانتے لگے ہیں۔ اسلام میں جو شورائیت ہے وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے دیے گئے دائرۂ کار کی پابند ہے۔ مثال کے طور پر گھر میں مہمان آئے ہیں۔ مشورہ ہوا کہ ان کی کس طرح خاطر مدارات کی جائے۔ پانچ افراد پر مشتمل خاندان میں سے تین بچوں نے کہا کہ انہیں چائے پلائے دیتے ہیں' دو نے کہا کہ انہیں کافی پیش کرتے ہیں۔ آپ نے اکثریت کی رائے پر عمل کرتے ہوئے انہیں چائے پلا دی۔ اب اگر پانچوں افراد انہیں شراب پلانے کی تجویز پیش کریں تو کیا یہ جائز ہوگا؟ ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں ہوگا۔ مغرب میں جائز ہے' کیونکہ ان کے نظام میں اکثریت کی حکمرانی ہے۔ عوام کی حکومت' عوام کے لیے اور عوام کے ذریعے۔ عوام کی حکمرانی کا نعرہ کتنا دلکش سمجھا جاتا ہے' حالانکہ یہ کفریہ نعرہ ہے۔ عوام حاکم کب سے ہوگئے؟ قرآن کے تین مقامات (الانعام: ۵۷' یوسف: ۴۰ و ۶۷) پر ارشاد ہوا: ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ کہ حکم کا اختیار تو صرف اللہ کے لیے ہے۔ ہمارے لیے جمہوریت نہیں خلافت ہے۔ ان کی جمہوریت میں آزادی ہے' لیکن کس سے آزادی؟ اللہ' اُس کے رسول ﷺ اور الہامی ہدایت سے۔ یہ ہے عوام کی آزادی۔ نفس کے غلاموں اور دنیا کے طالبوں کو یہ نعرے اچھے لگتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس طرح کے تصورات شوگر کوٹڈ انداز میں پیش کیے جاتے ہیں۔ اسلام کی واضح تعلیمات کے خلاف نظریات پر مبنی نظام کو خوشنما بنا کر اور اس کے ساتھ کچھ جھوٹے دلائل کی پیوندکاری کر کے مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔

مسلم حکمرانوں کا افسوس ناک طرزِ عمل

سقوطِ خلافت کے بعد کیا مسلم حکمرانوں کی سطح پر بھی اس کے احیاء کی کوئی کوشش ہوئی؟ ۱۹۲۶ء سے قبل ہی جامع ازہر کے علماء نے یہ سوال چھیڑا اور مسلم امہ کے سربراہوں کے سامنے رکھا کہ خلافت کی حیثیت ہے کیا؟ خلافت کے خاتمے کے بعد اس حوالے سے کوئی ذمہ داری بنتی ہے یا نہیں؟ ہمیں کسی اجتماعیت کی ضرورت ہے یا نہیں؟ ہمارا کوئی مرکزی پلیٹ فارم ہونا چاہیے یا نہیں؟ ان سوالوں کا جواب اگر اثبات میں ہے تو اس کا طریقۂ کار کیا ہو؟ چنانچہ اس پر سوچ بچار کے لیے مئی ۱۹۲۶ء میں قاہرہ میں ایک کانفرنس ہوئی۔ بدقسمتی کہ ہندوستان کا وفد نہیں جا سکا۔ اور بھی کچھ مسلم علاقوں کے سربراہان اور ذمہ داران شریک نہیں ہوئے۔ کچھ سیاسی مسائل تھے۔ انتہا یہ ہوئی کہ والیٔ مکہ شریف حسین کو انگریز نے استعمال کیا اور اُس نے وہاں ان کو در ہونے کا موقع دیا۔ وہاں پر بھی بغاوت کا معاملہ کھڑا ہوا اور آلِ سعود کو درآمد ہونے کا موقع ملا۔ انہوں نے قاہرہ کانفرنس کو تو اہمیت نہیں دی اور جولائی ۱۹۲۶ء میں مکہ مکرمہ میں کانفرنس طلب کی۔ یہاں ایک تاریک پہلو یہ ہے کہ انہوں نے خلافت اور خلیفہ والے عنوان کو پسند نہیں کیا۔ ہمارے ہاں کا ایک مکتبہ فکر بھی خلافت اور بیعت کا قائل نہیں ہے۔ خلافت کے قیام کی جدوجہد کے لیے کوئی امیر ہو اور اس سے بیعت کی

جائے' اس کا بھی وہ قائل نہیں ہے۔ یہی تصورات وہاں پر بھی تھے۔ چنانچہ وہاں پر خلافت کے بجائے ملوکیت کا نظام قائم ہوا۔ البتہ بادشاہ کے لیے 'خادم حرمین شریفین' کا عنوان اختیار کیا گیا تاکہ ان کی حکومت کو ایک مذہبی لیبل بھی مل جائے اور مسلمانوں میں مقبولیت بھی حاصل ہو جائے۔

آگے چل کر مسلم ممالک کی تنظیم ''او آئی سی'' بنی جس کو بالعموم Oh! I see کہا جاتا ہے۔ یہ نشستند و گفتند و برخاستند کا ایک فورم بن گیا۔ اس کے بعد دو تین کوششیں اور ہوئیں' لیکن لکھنے والوں نے لکھا کہ اس میں وہ سربراہانِ مملکت آتے تھے جو خود آمر اور مغرب کے آلۂ کار تھے۔ ان سے یہ توقع کہاں کی جا سکتی تھی کہ وہ خلافت کے احیاء کی کوششیں کریں گے جو امت کی خواہش اور ضرورت ہے اور رب کا منشا اور اس کا حکم بھی ہے۔

مسلم ممالک میں احیاءِ خلافت کی کوششیں

اب آیئے ان چند ممالک کے بارے میں گفتگو کریں جہاں احیاءِ خلافت کی کچھ کوششیں ہوئیں۔ اس سے اس بات کو تقویت ضرور ملتی ہے کہ پوری امت سو نہیں گئی۔ خلافت کے خاتمے سے بھی پہلے برصغیر میں تحریک خلافت شروع ہوئی۔ اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔ سقوطِ خلافت کے بعد مختلف ممالک میں دین کا درد رکھنے والوں نے اپنے اپنے مزاج' فہم اور حالات کی بنیاد پر یقیناً کچھ کوششیں کیں۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکی کو سیکولر ریاست اور فوج کو سیکولرزم کا محافظ قرار دیا' عربی زبان اور عربی میں اذان اور نماز اور مذہبی تعلیم پر پابندی لگا دی۔ لیکن آج ترکی جس مقام پر کھڑا ہوا ہے' الحمدللہ وہاں اسلامی نظریات رکھنے والے اتنے کمزور نہیں جتنا ماضی میں رہے ہیں۔ سقوط خلافت کے فوراً بعد وہاں کے علماء نے کوششیں شروع کیں جن میں معروف نام شیخ بدیع الزماں نورسیؒ کا تھا جن کی وفات ۱۹۴۰ء میں ہوئی۔ اُس وقت وہاں کے علماء نے وہ رویہ اختیار کیا جو برصغیر میں انگریز کی آمد پر علمائے دیوبند اور دیگر علماء نے اختیار کیا تھا۔ انگریز کی آمد پر یہاں دو ردِّعمل سامنے آئے تھے۔ ایک علی گڑھ کی جانب سے جن کا موقف یہ تھا کہ ہمیں انگریزی سیکھنی چاہئے اور سرکاری ملازمتیں حاصل کرنی چاہئیں۔ حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کے لیے یہ سب کرنا چاہیے۔ ممکن ہے کچھ لوگوں نے بڑی نیک نیتی سے یہ باتیں کی ہوں' لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب سرسید احمد خان نے یہ کام شروع کیا تو مغرب کی اتنی مرعوبیت طاری ہوگئی کہ انہوں نے دین کی مسلمہ باتوں مثلاً معجزات اور فرشتوں اور جنات کے وجود وغیرہ کو ماننے سے انکار کر دیا۔ علماء کی جانب سے ردِّعمل یہ تھا کہ ہمارے بس میں ابھی ان کا مقابلہ کرنا تو نہیں ہے لہٰذا مساجد اور مدارس کے حلقوں میں قال اللہ اور قال الرسول کی صدا جاری رکھیں تاکہ لوگوں کا کم از کم ایمان تو محفوظ رہے' اور اس حد تک انہیں کامیابی حاصل ہوئی۔ مقصد یہ تھا کہ کل کلاں کوئی دین کا

جذبہ پیدا ہوگا تو اس کے لیے بنیاد ایمان موجود ہوگا۔ اسی طرز پر ترکی میں بھی کوشش کی گئی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اس وقت تو فوج کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں' اپنے دین وایمان کو محفوظ رکھو۔ الحمدللہ یہ کام وہاں آگے بڑھا ہے۔ ترکی کی رفاہ پارٹی بہت مشہور ہے۔ ان تمام ممالک ترکی' سوڈان' الجزائر' مصر وغیرہ میں اکثر اسلام پسند جماعتیں انتخابی سیاست میں گئی ہیں۔ انہی محنتوں کے نتیجے میں رفاہ پارٹی بھی بنی جس نے کئی انتخابات میں حصہ لیا اور نجم الدین اربکان جو ایک بہت بڑے اسلامی نظریہ کے حامل شخص تھے' ترکی میں وزیراعظم بنے۔ اس کے بعد وہاں جو کچھ بھی معاملات ہوئے وہ ہمارے سامنے ہے۔ اس گفتگو کو اس تناظر میں نہ لیجئے کہ جس پارٹی نے جو طریقہ اختیار کیا' وہی صحیح ہے۔ ان کی ناکامی کی وجوہات پر ابھی ہم گفتگو نہیں کر رہے ہیں۔

انڈونیشیا ۱۹۴۹ء میں ولندیزی اور اطالوی قوم کی غلامی سے آزاد ہوا۔ یہاں کئی تحریکیں چلی ہیں' مثلاً حزب اللہ' شرکت اسلام وغیرہ۔ علماء کے مختلف طبقات نے یہاں کوششیں کیں۔ یہاں بھی یہ تحریکیں انتخابی سیاست میں آئیں اور ایک وقت میں یہاں ان کو ۴۳ فیصد سیٹیں ملیں۔ جب انہوں نے اسلامی ریاست کا مطالبہ رکھا تو وہاں کے سوشلسٹ' کمیونسٹ اور نیشنلسٹ خیال کے لوگ آڑے آئے اور بات آگے نہیں بڑھ سکی۔ مگر اسلامی نظریات اور دین کے بحیثیت ایک نظام غلبے کے لیے وہاں پر بھی کوششیں دکھائی دیتی ہیں۔

سوڈان میں ایک بہت مشہور نام مہدی سوڈانیؒ کا ہے۔ انگریز یہاں پر قابض رہا اور عجیب بات یہ کہ مصری لوگ بھی یہاں پر قابض رہے ہیں۔ ۱۸۸۵ء میں یہاں آزادی کی تحریک چلی اور سوڈان کو آزادی ملی مگر ۱۸۹۹ء میں یہاں انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہوگیا۔ الاخوان المسلمون مصر میں بنی تھی' اس کی ایک شاخ ۱۹۲۸ء میں سوڈان میں بھی قائم ہوئی اور مختلف ناموں سے مختلف لوگوں نے اسلام کی خدمت کرنے کی کوشش کی۔ اسلامک لبریشن فرنٹ جو ایک بہت بڑا گروپ تھا' سیاست میں اترا' یہاں تک کہ ۱۹۸۹ء میں جنرل حسین نے شریعت کے نفاذ کا اعلان بھی کر دیا۔ سوڈان کو میڈیا نے بہت زیادہ نظرانداز کیا ہے۔ البتہ ۱۹۸۸ء میں میڈیا نے سوڈان کو کوریج دی تھی جب وہاں کی ایک دواساز فیکٹری پر یہ کہہ کر حملہ کیا گیا کہ یہاں ہتھیار بنتے ہیں اور اسامہ بن لادن اور القاعدہ کو یہاں سے سپورٹ دی جاتی ہے۔

الجزائر پر فرانس کا قبضہ رہا' مگر علماء نے یہاں بھی وہی ذہن سازی' دین کی حفاظت کا کام کیا جو ترکی میں ہوتا رہا' تاآنکہ فرانس مجبور ہوا کہ وہاں کا قبضہ چھوڑ دے' مگر ۱۹۶۲ء میں اقتدار سوشلسٹ رہنماؤں کے حوالے کر دیا گیا جنہوں نے نفاذ اسلام کے تقاضے کو تسلیم نہیں کیا۔ یہاں کی مذہبی جماعتیں اور نظریات رکھنے والے لوگ انتخابات میں کامیاب ہوئے' مگر فوج آڑے آگئی اور نفاذِ

اسلام کا مطالبہ پورا نہ ہوا۔

مغرب جب چاہتا ہے حسنی مبارک جیسے لوگوں کو بٹھا دیتا ہے کیونکہ آمریت اس کو پسند ہوتی ہے اور جب چاہتا ہے ضیاء الحق کو ہٹانے اور جمہوریت کو لانے کی بات کرتا ہے۔ مسلم ممالک میں جمہوری راستے سے جب مذہبی پارٹیاں اوپر آئیں تو فوج کو اوپر لاکر بٹھا دیا گیا اور اسلام کا نفاذ نہیں ہوسکا۔ مسلم ممالک میں یہ دو باتیں مشترک نظر آتی ہیں۔ اسلامی نظریاتی لوگوں کا سیاسی میدان میں اترنا اور اگر اس ذریعے سے انہیں کامیابی مل بھی گئی تو فوج کا آڑے آکر نفاذ اسلام کو روکنا۔

حسن البناء شہیدؒ نے مصر میں ۱۹۲۸ء میں الاخوان المسلمون کی بنیاد رکھی۔ اس بات پر تو کوئی دو رائے نہیں ہوسکتیں کہ دنیا میں اس دور میں کسی اسلامی تحریک میں جذبہ اگر دیکھنا ہو تو الاخوان المسلمون کے افراد میں دیکھا جانا چاہیے۔ کسی سے طریقہ کا اختلاف ہونا ایک الگ شے ہے لیکن اگر کسی میں کوئی خوبی ہے تو اس کا اعتراف کرنا پسندیدہ امر ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ جو اچھا ہے اسے لے لو اور جو برا ہے اسے چھوڑ دو۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ فرماتے تھے کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ساتھیوں کا حلیہ تبلیغی جماعت والوں جیسا ہو' ان کی فکر وسوچ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ والی ہو اور ان میں جوش' جذبہ اور حرکت الاخوان المسلمون والی ہو۔ دین کی جدوجہد کوئی چھوٹا سا کام نہیں' یہ بہت بڑا مشن ہے جس میں نسلیں کھپ جاتی ہیں۔ اخوان نے ۱۹۴۰ء میں انتخابی سیاست میں آنے کی کوشش کی۔ ۱۹۴۶ء میں کافی امید تھی کہ انہیں کامیابی ملے گی لیکن ایک سازش کے ذریعے ان کو ہرایا گیا اور ۱۹۴۹ء میں حسن البناء کو شہید کر دیا گیا۔ مصیبتوں کے کئی ادوار اس تحریک پر گزرے ہیں۔ ۱۹۵۴ء میں اخوان پر جمال عبدالناصر کے قتل کا الزام لگایا گیا اور ان کے لوگوں کو شدید تشدد سے گزارا گیا۔ پھر ۱۹۶۵ء میں حکومت کا تختہ الٹنے کا الزام دے کر اسے کچلنے کی کوشش کی گئی۔ ۱۹۶۶ء میں سید قطب شہیدؒ جن کی تفسیر ''فی ظلال القرآن'' بہت مشہور ہے' جس کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے' ان کو بھی شہید کر دیا گیا۔ اس کے بعد بھی اخوان کی انتخابی سیاست کے ذریعے کوششیں جاری رہیں۔ بعد میں انہوں نے یہ حکمت عملی اختیار کی کہ دیگر سیاسی جماعتوں کو سامنے رکھ کر اور خود پس منظر میں رہ کر ذہن سازی' تحریک اور اس کے لیے جذبے کی آبیاری کرتے رہے۔ ان کی ایک اور حکمت عملی یہ بیان کی گئی کہ ان کے خیال میں اگر ہم نے سامنے آکر قیادت کی تو مغرب اس کو اسلامی دہشتگردی کا نام دے کر کچل دے گا۔

ایران کے اہلِ تشیع سے عقائد کے حوالے سے ہمارے شدید اختلافات ہیں۔ ایران میں آنے والے انقلاب کو ہم نے کبھی آئیڈیل اسلامی انقلاب نہیں کہا' لیکن یہ ضرور کہا کہ انقلاب آیا تھا۔ وہاں پہلے کیسٹ ریولوشن رہا' جس کے ذریعے پچیس برس تک ذہن سازی کی گئی۔ کہا جاتا ہے

کہ پہلا جلوس جو نکالا گیا وہ چار ہزار خواتین پر مشتمل تھا جن کی گودوں میں بچے بھی تھے' اور ان کو بھون دیا گیا تو پورے ملک میں لوگ کھڑے ہو گئے۔ اس کے نتیجے میں وہاں ڈھائی ہزار سالہ بادشاہت کو ختم ہونا پڑا جو عوامی سطح پر ایک پائیدار تحریک کے ذریعے ہوا۔ ایک وقت آیا کہ فوج نے بھی گولی چلانے سے انکار کر دیا۔ مصر میں بھی ایک موقع پر فوج نے گولی چلانے سے انکار کر دیا تھا۔ پانچ چھ ممالک جن کا تذکرہ اوپر آیا ان کے مقابلے میں یہ ایک مختلف تجربہ تھا کہ غالب نظام کو چیلنج کرنا اور میدان میں آ کر اس کی تبدیلی کی کوشش کرنا' مگر اس کوشش کو منظم اور پائیدار بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے پچیس تیس سال کی محنت موجود تھی۔

جب ۱۹۲۴ء میں خلافت کا خاتمہ ہوا اور اس سے قبل ۱۹۱۸ء میں بالفور ڈیکلریشن منظور ہوا اور یہود کو برطانیہ کی طرف سے آزادی دے دی گئی کہ اپنی ریاست قائم کریں اور ترکی کے حوالے سے ان کے عزائم سامنے آئے تو برصغیر میں تحریک خلافت شروع ہوئی۔ اس تحریک کے رہنماؤں میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی نمایاں تھے۔ حد تو یہ ہے کہ اس تحریک میں گاندھی بھی انگریزوں کی مخالفت کی بنا پر شامل ہو گیا' لیکن بعد میں اس نے علیحدگی اختیار کر لی۔ تحریکِ خلافت کا آغاز ۱۹۱۹ء میں ہوا جس کے مقاصد یہ بیان کیے گئے کہ ترکی کی خلافت کو برقرار رکھا جائے' مقاماتِ مقدسہ ترکی کی تحویل میں رہیں اور ترکی کو تقسیم نہ کیا جائے۔ غور کیجیے ایسی تحریک پوری دنیا میں کہیں نہیں چلی۔ ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت کا ایک وفد مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں انگلستان بھی گیا۔ برطانیہ کے وزیراعظم نے اس وفد کو یہ جواب دیا کہ آسٹریلیا اور جرمنی سے خوفناک انصاف ہو چکا ہے' ترکی اس سے کیونکر بچ سکے گا؟ گویا انہوں نے ترکی کے خلاف اپنے عزائم ظاہر کر دیے۔ یہ وفد وہاں سے مایوس ہو کر لوٹا۔ اس کے بعد برصغیر میں 'تحریک ترکِ موالات' کے نام سے ایک سول نافرمانی کی تحریک چلی۔ اس میں طے ہوا کہ تاجِ برطانیہ کے خطابات واپس کر دیے جائیں' کونسلوں کی رکنیت سے استعفا دیا جائے' سرکاری ملازمتوں سے علیحدگی اختیار کی جائے' تعلیمی ادارے سرکاری امداد لینا بند کر دیں۔ اس تحریک کے دوران کئی مسلمانوں کو شہید کیا گیا' جس کے نتیجے میں ایک تھانے کو آگ لگا دی گئی۔ اس پر گاندھی یہ کہہ کر اس تحریکِ موالات سے علیحدہ ہو گیا کہ اب اس تحریک میں تشدد شروع ہو گیا ہے۔ تحریک خلافت کو کامیابی تو حاصل نہیں ہوئی لیکن اس سے مسلمانوں میں جذبہ ضرور بیدار ہوا جس کے نتیجے میں دو قومی نظریے کی بنیاد پر تحریک پاکستان چلی اور ۱۹۴۷ء میں پاکستان قائم ہوا۔ لیکن آج کے دانشور یہ سب کچھ ماننے کو تیار نہیں۔ ہم نے تو یہی پڑھا تھا کہ تحریکِ پاکستان کا نعرہ تھا: ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ!''۔ ہم نے مطالعہ پاکستان میں یہی پڑھا تھا کہ ۱۹۴۹ء میں دستور ساز اسمبلی میں 'قراردادِ مقاصد' منظور کی گئی جس میں

یہ طے کر دیا گیا کہ اس ملک میں حاکمیت کا اختیار اللہ تعالیٰ کو ہے۔ دوسرا نکتہ یہ کہ قرآن وسنت سے متصادم کوئی قانون سازی نہیں کی جا سکتی۔ یہ اُس وقت کے سیکولر ماحول میں ایک بہت بڑا اعلان بغاوت تھا' کیونکہ دنیا سیکولرزم کی بات کرتی ہے جس کے مطابق ریاستی امور میں مذہب کا کوئی عمل دخل نہیں ہوگا۔ اللہ نے چھپر پھاڑ کر ہمیں یہ خطۂ زمین دیا اور ہم نے اعلان کیا کہ حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔

کالم نویس عباس اطہر نے ایکسپریس اخبار میں لکھا تھا کہ ہم مسلمان ناموسِ رسالت کے نام پر بڑے جذباتی ہو جاتے ہیں' جبکہ انڈونیشیا' ملائیشیا وغیرہ میں تو ایسا نہیں ہے۔ یہ جو ہمیں کہا جا رہا ہے کہ ہم میں تحمل اور برداشت کا جذبہ ہونا چاہیے' ہم میں رواداری ہونی چاہیے' وہ کان کھول کر سن لیں کہ ہم میں یہ سب کچھ ہے۔ اگر تحمل نہ ہوتا تو 295C کے تحت ایک ہزار سے زیادہ کیس جن کے خلاف ریکارڈ ہوئے تھے' یہ سارے مارے جاتے۔ کسی نے قانون ہاتھ میں نہیں لیا کیونکہ ہم میں تحمل ہے۔ البتہ ہم بے غیرت نہیں۔ تمہارے مغربی آقا ہائیڈ پارک میں کھڑے ہو کر اپنے رسول عیسیٰ علیہ السلام کو برا بھلا کہتے ہیں۔ یہ ان کی بے غیرتی ہے۔ ہم اپنے رسول ہی نہیں' کسی رسول کی شان میں بھی گستاخی برداشت نہیں کر سکتے۔ پوری دنیا میں ہم ہی جذباتی ہیں کہ ۱۹۴۹ء میں یہ طے کر دیا کہ حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے' یہ ملک اسلام کے نام پر بنا ہے۔ کوئی مسلم ملک اسلام کے نام پر نہیں بنا۔ قیام پاکستان کے بعد کی تاریخ کا ہم سب کو علم ہے۔ کراچی میں اکثر بسنے والے مہاجر کہلاتے ہیں۔ ہمارے آباء واجداد بھی بھارت سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ وہ کیا یہاں کاروبار کی غرض سے آئے تھے؟ بھارت میں کاروبار کیا کم ہے؟ بل گیٹس اگر گیا تو بھارت گیا۔ کلکتہ میں وہ آئی ٹی سٹی بنا رہے ہیں۔ دنیا کی کاسمیٹکس کا سب سے بڑا خریدار بھارت ہے۔ سپر کمپیوٹر اس نے بنایا ہے۔ ہمارے آباء واجداد اپنی جان و مال اور عزت کی قربانی دے کر اسلام کے نام پر یہاں آئے تھے۔ ہم اپنا جائزہ لیں۔ آج ہمیں اسلام کتنا پسند ہے؟ جس کے پاس دو پیسے آئے اس کے گھر سے پردہ رخصت ہوا۔ ہمارے گھر میں اگر گلاس ٹوٹ جائے تو ہمیں غصہ آ جاتا ہے' اللہ کا حکم ٹوٹتا ہے تو ہمیں غصہ نہیں آتا۔ یہ عوام کا حال ہے اور اس سے بڑھ کر ہمارے حکمرانوں کا حال ہے۔

اب میں زاہد اقبال صاحب جن کی کتاب کا ذکر قبل ازیں آ چکا ہے' کا ایک تجزیہ پیش کر رہا ہوں۔ (نظام خلافت اور ہماری ذمہ داریاں' ناشر: ادارہ نشریات محمود حسن' کراچی) مسلم دنیا میں اسلام کے احیاء کے لیے جتنی بھی تحریکیں چلتی رہیں ان میں کچھ مشترک عنصر ہیں جن پر توجہ کی ضرورت ہے۔ ان تحریکوں کی ہمیں خاطر خواہ کامیابی دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ مسلم ممالک میں فوج کا کردار بدترین ہے اور نفاذِ اسلام میں اکثر و بیشتر آڑے آنے والی فوج ہی ہے۔ اگر سیاسی

انتخابی راستے سے جماعتیں اقتدار میں آ بھی جائیں تو فوج سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اسلامی ذہن رکھنے والوں کے لادینی عناصر سے اشتراکِ عمل نے بھی تحریکوں کو نقصان پہنچایا ہے‘ جو کہ انتخابی سیاست کا ایک ناگزیر جزو ہے۔ ہمارے ملک میں اسلام کا نام لینے والی ایک بہت بڑی جماعت کے دفاتر میں عیسائیوں کے ساتھ کرسمس کا تہوار منایا گیا‘ کیک کاٹے گئے‘ پریس ریلیز بھی جاری ہوئے‘ اخبارات میں تصاویر بھی شائع ہوئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اسلامی ذہن والوں کا پیر پگاڑا کے ساتھ کیک کاٹنا اور آم کی پارٹی کرنا سمجھ میں نہیں آتا۔ لادینی عناصر کے اپنے مفادات ہوتے ہیں‘ اسلام سے ان کا کیا تعلق؟ ان سے کیا توقعات وابستہ کی جاتی ہیں؟ انتخابات کے گورکھ دھندے میں یہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ جب ۱۹۷۳ء کے دستور میں اسلامی دفعات شامل ہوئیں تو گنتی کے چند باریش حضرات پارلیمنٹ میں شامل تھے۔ لیکن ایک سو سے زیادہ باریش ارکان پارلیمنٹ کی موجودگی میں پرویز مشرف نے حدود آرڈیننس کا حلیہ بگاڑ کے رکھ دیا۔ انتخابی سیاست کے یہ نتائج برآمد ہوئے۔

جامعہ اشرفیہ میں دیوبندی مکتبۂ فکر کے سینکڑوں علماء جن میں اکابرین بھی شامل تھے اور سیاسی مذہبی جماعتوں کے قائد مولانا فضل الرحمٰن صاحب بھی تھے‘ نے رائے پیش کی کہ پائیدار ذہنی تبدیلی‘ منظم جدوجہد اور مطالباتی تحریک کے ذریعے شریعت کے نفاذ کا مطالبہ کیا جائے۔ یہ کم وبیش وہی بات ہے جو بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا موقف تھا جو وہ چالیس پچاس سال سے بیان کرتے آ رہے تھے۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ شیخ رشید نے کبھی مائیکل جیکسن اور میڈونا کو پاکستان بلانے کا کہا تھا اور جماعت اسلامی نے ’الحمدللہ‘ الٹی میٹم دیا تھا جس کے نتیجے میں ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ ختمِ نبوت کی تحریک سڑکوں پر پہلے چلی‘ پارلیمنٹ میں قادیانیوں کو کافر قرار دینے کا معاملہ بعد میں ہوا۔ ناموسِ رسالت پر اگر حکمرانوں کو سدھارنا پڑا تو عوام سڑکوں پر آئے۔ یہ سب اشارے ہیں۔ اس نہج پر ہمیں سوچنا ہوگا۔

ہم کہاں کھڑے ہیں؟

اس وقت ہم کہاں کھڑے ہیں؟ اس پر کچھ تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ آج ہماری وحدت ختم ہو چکی ہے۔ ہم پاکستانی‘ عراقی اور افغانی مسلمان ہیں۔ ہم سب اپنا جائزہ لے لیں کہ کیا ہم عراق‘ شام اور افغانستان کے مظلوم مسلمانوں کے لیے دعا بھی کرتے ہیں۔ کیا ہم اپنی قوم کی بیٹی عافیہ صدیقی کے لیے دعا کرتے ہیں؟ آج ہماری گراوٹ اور بے حسی کی انتہا یہ ہے کہ ہم دعا بھی نہیں کرتے۔ ہم کشمیر کو فتح کرنے کی بات تو کرتے ہیں‘ اور ان شاء اللہ کریں گے لیکن ابھی ہم ان کے لیے دعا بھی نہیں کر رہے ہیں۔ یہ امت نماز کے لیے نیند کی قربانی دینے اور دین کے لیے وقت دینے کو تیار نہیں۔ دین کی راہ میں مال خرچ کرنے کے لیے تیار نہیں۔ میں اکثریت کی بات کر رہا ہوں‘ دین کا درد رکھنے والے کر رہے ہیں‘ اللہ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین! جس کے دل میں خلوص

ہے‘ اللہ کے ہاں اس کی قدر ہوگی۔ ہم حصہ کہاں ڈال رہے ہیں؟ باطل کے یا حق کے پرچار میں؟ نظامِ باطل کی پشت پناہی میں یا نظامِ خلافت کے احیاء کی تحریک کی جدوجہد میں؟

چھٹی اور آخری بات یہ کہ آئندہ آنے والا دور کس شان کے ساتھ آئے گا؟ اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ کی تین احادیث مبارکہ کو ہم نے بہت عام کیا ہے۔ پہلی حدیث مبارکہ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور مسند احمد میں وارد ہوئی ہے۔ اس کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت کے پانچ ادوار ہیں۔ جب تک اللہ چاہے گا تمہارے درمیان نبوت رہے گی اور جب وہ چاہے گا اس کو ختم کر دے گا۔ پھر نبوی طریق کار کے مطابق خلافت کا نظام قائم ہوگا۔ (یہ خلفائے راشدین کا دور ہے۔) جب تک اللہ چاہے گا یہ برقرار رہے گا اور جب وہ چاہے گا یہ دور بھی ختم ہو جائے گا۔ پھر کاٹ کھانے والی بادشاہت کا دور ہوگا۔ (وہ مسلمان حکمران جو اپنے آپ کو خلفاء قرار دیتے تھے اور بدترین ظلم وستم کرتے تھے۔) پھر مجبوری کا دور ہوگا۔ (وہ دور جس سے آج ہم گزر رہے ہیں۔ ہم پاکستانی ہیں لیکن امریکہ کے تابع ہیں‘ مجبوراً ہماری حکومتوں کو ان کی بات ماننی پڑتی ہے۔) اللہ جب تک چاہے گا یہ دور بھی رہے گا اور جب وہ اسے ختم کرنا چاہے گا‘ یہ دور بھی ختم ہو جائے گا۔ پھر نبوی طریقۂ کار کے مطابق خلافت کا نظام قائم ہوگا۔ (ان شاء اللہ۔) پھر رسول اللہ ﷺ نے خاموشی اختیار فرمائی۔ یعنی پھر دنیا ختم ہوگی۔

دوسری حدیث مسلم شریف کی ہے اور یہ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’اللہ تعالیٰ نے مجھے پوری زمین لپیٹ کر دکھائی۔ میں نے اس کے مشرق بھی دیکھے اور اس کے مغرب بھی دیکھے۔ میری امت کا اقتدار وہاں تک پہنچے گا جہاں تک زمین مجھے لپیٹ کر دکھا دی گئی‘‘۔ اللہ رب العزت جو اپنے حبیب ﷺ کو شب معراج میں زمین سے آسمانوں تک لے جا کر میں کائنات کے اسرار و رموز دکھا سکتا ہے اُس کے لیے اس چھوٹی سی زمین کے مشارق و مغارب اپنے حبیب ﷺ کو دکھانا کوئی مشکل کام ہے؟ اس کی مزید تشریح اگلی حدیث مبارکہ میں آئے گی۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بائیس لاکھ مربع میل پر ہماری حکومت تھی۔ ایشیا‘ یورپ اور افریقہ ہمارے پاس تھے۔ سلطنتِ عثمانیہ کے دور میں بھی یہ تین براعظم ہمارے پاس تھے۔ پوری زمین پر ہماری حکومت کا قائم ہونا باقی ہے۔ سورۃ الصّف میں فرمایا گیا:

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ ؕ﴾ (آیت ۹)

’’وہ (اللہ) ہے جس نے اپنے رسول ﷺ کو بھیجا الہدیٰ (قرآن) اور دین حق (اسلام) دے کر تاکہ آپؐ اس کو کل نظام زندگی پر غالب کر دیں‘‘۔ اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ اللہ کے رسول ﷺ! یہ تو ہو گیا نا؟ یہ وعدہ تو پورا ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں۔ کل نظام زندگی

پر غلبے کی بات بعد کے لیے بھی ہے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ میری امت کا اقتدار وہاں تک پہنچے گا جہاں تک مجھے زمین لپیٹ کر دکھائی گئی۔

ہم سب کمزور انسان ہیں۔ یہ بات ہمیں عجیب لگتی ہے۔ آج ایک ریمنڈ ڈیوس کے لیے امریکہ ہم پر چڑھ دوڑا۔ کیا ہم نے بھی کسی کے لیے ایسا کیا ہے؟ ہم نے ظلم کرنے کے لیے نہیں' بلکہ ظلم سے نجات دلانے کے لیے ایسا کیا ہے! جب محمد بن قاسمؒ کو ایک خاتون کے خط پر بھیجا جاتا ہے۔ آج ہم امریکہ کو جزیہ (ٹیکس) دے رہے ہیں۔ جزیہ ہم نے بھی لیا ہے۔ اصولی بات یاد رکھئے کہ اگر یہ ارشادات رسول اللہ ﷺ کے نہ ہوتے تو شاید ہم بھی یقین نہ کرتے۔ ایمان کا تقاضا ہے کہ اسے مانا جائے۔ جس نے کبھی صبح کی روشنی نہ دیکھی ہو' اگر وہ رات کی تاریکی ہی میں بیٹھا ہے تو صبح کی روشنی کو کبھی نہیں مانے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس پوری کائنات کی روشنی دیکھی تھی اور آپؐ نے ہمیں یہ روشنی دکھائی ہے کہ ایسا ہوگا۔ کس سطح پر ہوگا؟ اس کے لیے اگلی حدیث ملاحظہ کیجیے۔ حضرت مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ سے مروی مسند احمد کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''زمین پر نہ کوئی مٹی گارے کا گھر اور نہ کوئی جانور کی کھال کا بنا ہوا خیمہ بچے گا جس میں اللہ اسلام کے کلمے کو داخل نہ فرما دے گا' خواہ عزت والے کے اعزاز کے ساتھ خواہ کسی مغلوب کی مغلوبیت کی صورت میں۔ (یعنی) یا تو لوگ اسلام قبول کرنے کے نتیجے میں خود بھی عزت کے مستحق بن جائیں گے یا اسلام کی بالادستی تسلیم کر کے اس کی فرماں برداری قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے''۔ صحابیؓ کہتے ہیں کہ اس پر میں نے کہا کہ پھر تو دین پورے کا پورا اللہ کے لیے ہو جائے گا!

ہم نے جزیہ لیا ہے تو اس کے عوض لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کو تحفظ دیا ہے۔ آج ہم ذلت و رسوائی میں مبتلا ہیں لیکن آنے والے دور میں یہ تصویر ہوگی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ ہم ہوں یا نہ ہوں' یہ تو ہو کر رہے گا۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم اگر آج چلے گئے تو اللہ کو کیا جواب دیں گے؟ اس آنے والے مبارک دور کے لیے جدوجہد میں کیا ہم اپنا حصہ ڈال رہے ہیں؟ ہم اس کے مکلّف اور ذمہ دار ہیں۔ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا مکہ مکرمہ میں شہید ہو گئیں۔ دین غالب نہ ہوا تھا۔ حضرت حمزہ اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہما اُحد کے میدان میں شہید ہو گئے۔ دین غالب نہ ہوا تھا۔ مگر یہ لوگ اللہ کے ہاں کامیاب ہو گئے۔ دین آگے چل کر غالب ہوا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے چھ سو برس پہلے فرمایا تھا: میں آنے والے محمد ﷺ کے لیے راستے کو صاف کر رہا ہوں۔ خلافت کی تحریکیں تو ان شاء اللہ چلتی رہیں گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ عزم لے کر جانے کی توفیق دے کہ ہم اس میں اپنا حصہ ڈالیں۔ یہی تنظیم اسلامی کی دعوت ہے۔

تنظیم اسلامی کا پیغام　　نظامِ خلافت کا قیام!

(جاری ہے)